اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مئی ۲۰۲۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan May 2023

﴿اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ﴾

''اور میں کچھ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تمہاری اصلاح کروں جتنی کر سکوں۔''

اسلامی تعلیمات پر عمل کے تناظر میں

اصلاح کیجیے

پہلے اپنی

پھر دوسروں کی

(اہل خانہ کی، خاندان کی، معاشرے کی)

پھر حکومت کی

تحریک اصلاح المسلمین

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی نئی تصنیف

اسلام اور تعمیرِ سیرت

عصرِ حاضر میں

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

’اسلام اور تزکیۂ نفس‘ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی ضخیم علمی کتاب (۹۲۸ صفحات) اور دو مختصر کتابچوں کے باوجود ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس میں اس موضوع کا احاطہ بھی کیا گیا ہو اور وہ متوسط حجم کی بھی ہو۔ بہت سے اضافی مباحث کے ساتھ۔ ۴۰۸ صفحات

مکتبہ البرہان

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

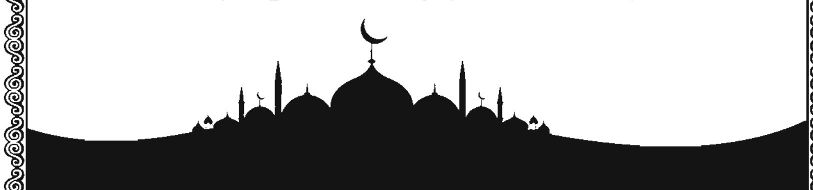

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی نئی تالیف

امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل

[پاکستانی تناظر میں]

عصرِ حاضر میں مسلم امہ کو جو چیلنجز درپیش ہیں، ان میں سے سب سے بڑے دو ہیں: ایک: زوال امت اور دوسرا مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ۔ ان چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلم اہلِ علم اور دینی قائدین نے اب تک جو حل پیش کیے وہ جزوی اور غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں لہٰذا نئی اپروچ کی ضرورت ہے جس کی وضاحت اس کتابچے میں کی گئی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۴۸ قیمت: ۸۰ روپے

مکتبہ البرہان

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور
جلد ۲۷، شمارہ ۵، مئی ۲۰۲۳ء/شوال ۱۴۴۴ھ

مشمولات

فکر و نظر
- بھوک۔ بھوک اور ننگ۔ اور مہنگائی ۴
- رمضان اور قرآن — مدیر ۵

تعلیم و تربیت
- دینی مدارس کے نصاب و نظام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے (آخری قسط) — مولانا مفتی تقی عثمانی ۶
- تجاویز برائے قومی نصاب — پروفیسر محمد رضوان الحق و محمد ابراہیم ۱۴
- سکولوں میں قرآن حکیم کی تدریس — سلیم طارق لون ۲۵

تفہیم دین
- پاکستان کے موجودہ معاشی بحران کا حل — ڈاکٹر محمد امین ۲۸

فقہ و قانون
- سپریم کورٹ کا ایک اور غیر شرعی فیصلہ — مدیر ۴۴
- پارلیمنٹ سپریم ہے یا عدلیہ؟ ۶۲

تفہیم مغرب
- جدیدیت کی آئیڈیالوجی غیر اسلامی ہے — ڈاکٹر رشید ارشد ۶۶
- کیا جدیدیت قابل رد نہیں؟ — حافظ عمران طحاوی ۷۱

تزکیۂ نفس
نفسِ لوّامہ کی تلاش — ڈاکٹر خورشید رضوی ۷۶

English Section ۸۲
Human Rights: An Imperialist Weapon
Dr. Javead Akber Ansari

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 40,000 روپے

محمد خباب خزانہ دار
سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک، لاہور
PK55SCBL0000001212265001
تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ

برائے رابطہ
۹۱۔ بابر بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

بھوک۔ بھوک اور ننگ۔ اور مہنگائی

ہمارا سیاسی اور معاشی نظام
نہ اسلامی ہے، نہ انسانی ہے، نہ عوامی ہے اور نہ عقلی ہے۔
۹۰ فیصد غریب اور متوسط طبقے پر ۱۰ فیصد امیر طبقہ حکمران ہے جو محض اپنے مفادات کا نگہبان ہے۔

ارب پتی نواز شریف، ارب پتی زرداری اور کروڑ پتی عمران خان
عام آدمی کے درد کو کیا سمجھیں گے؟
لازم ہے کہ اس نظام کو چیلنج کیا جائے
لازم ہے کہ اسے رد کردیا جائے
لازم ہے کہ مظلوم اور مقہور اٹھیں
اور کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دیں
کہ دو وقت کی عزت کی روٹی ان کا حق ہے
وہ بنیادی حق جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا

فکرو نظر

رمضان اور قرآن

اے قوم!

تم نے حال ہی میں رمضان گزارا

ماہِ رمضان ماہِ قرآن ہے

قرآن کا یہ تم پر حق ہے کہ

تم اسے پڑھو، سمجھو، اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ

تم نے کبھی سوچا!

تم میں سے کتنے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں؟

تم میں سے کتنے ہیں جو اسے پڑھ کر یا سن کر سمجھتے ہیں؟

تم میں سے کتنے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں؟

تم میں سے کتنے ہیں جو اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں؟

سوچو! غور کرو!

کیا تم نے رمضان کا حق ادا کیا ہے؟

کیا تم نے قرآن کا حق ادا کیا ہے؟

تحریک رجوع الیٰ القرآن

تعلیم و تربیت

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

دینی مدارس کے نصاب و نظام پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے (آخری قسط)

متجددین کے دفاع نے بعض نئی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں

(ب) چونکہ ان مغربی نظریات پر مؤثر اور بھرپور تنقید کے لیے ان کے اصل مآخذ تک رسائی ضروری ہے اس لیے اب تک یہ کام ان لوگوں نے انجام دیا ہے جو ان ماخذ تک رسائی تو رکھتے تھے لیکن انہوں نے دینی علوم باقاعدہ متوارث طور پر اساتذہ سے نہیں پڑھے تھے۔ اس کی بجائے ان کی دینی معلومات متفرق مطالعے پر مبنی تھیں جن سے ظاہر ہے کہ علم کا رسوخ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے ان لوگوں نے ان مغربی نظریات کے مقابلے میں دین کی جو تشریح و تعبیر کی وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں پر مبنی تھی اور اس سے مغربی گمراہیوں کا صحیح علاج ہونے کے بجائے الٹا کچھ نئی گمراہیاں، نئے فتنے اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جن سے خود مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار کا دروازہ کھل گیا۔ ان نئی غلط فہمیوں کا مؤثر سدباب صرف سلبی انداز میں نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ علم دین میں رسوخ رکھنے والے علماء بذات خود ایجابی طور پر کام کریں جس کی غلط انجام دہی نے ان نئی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

(ج) مغرب کے مستشرقین نے عربی اور اسلامی علوم پر "تحقیق" کے نام سے ایسے زہریلے لٹریچر کا ایک انبار تیار کر دیا ہے جس کا مقصد دین کے بنیادی مسلمات کو مشکوک بنانا ہے۔ لٹریچر جدید ذہن کی نفسیات کے مطابق اور اس اسلوب میں تیار کیا گیا ہے جو آج کے ذہن کو اپیل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور عالم اسلام کا کوئی خطہ اس کے زہریلے اثرات سے خالی نہیں۔ اس زہر کا تریاق فراہم کرنا بھی علماء ہی کی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے انگریزی زبان اور ان عصری علوم کی تحصیل لازمی ہے جن کو اس کاروائی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔

(د) اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا اور مشرقِ بعید کے ممالک میں آباد ہے۔ ان لوگوں کو اور بالخصوص ان کی نئی نسلوں کو اسلام پہنچانے کا کوئی راستہ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ ان خطوں کے مسلمانوں کو اب نئی نسلوں کے دین کی

حفاظت کا مسئلہ درپیش ہے اور وہ اس غرض کے لیے کافی جدوجہد کے بعد مساجد اور دینی مراکز تعمیر کر رہے ہیں۔ ان مساجد اور مراکز میں ایسے علماء کی ضرورت روز افزوں ہے جو علوم دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی جانتے ہوں تاکہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی دینی ضروریات پوری کرسکیں۔ راقم الحروف کو ایسے متعدد ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور یہاں رہتے ہوئے بھی شاید ہی کوئی مہینہ خالی گزرتا ہو جس میں وہاں سے انگریزی جاننے والے علماء کی طلب نہ آتی ہو۔

چونکہ ایسے صحیح الفکر اور راسخ علماء کی تعداد ہمارے درمیان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے جو انگریزی جانتے ہوں، اس لیے ان تمام مقامات پر وہ لوگ پہنچ رہے ہیں جو انگریزی تو بے شک جانتے ہیں لیکن یا تو ان کی دینی معلومات سطحی اور سرسری نوعیت کی ہیں یا ان کے نظریات "ما انا علیہ واصحابی" کے مطابق نہیں ہیں۔

یورپ میں دین کے تحفظ کے لیے انگریزی زبان میں دینی لٹریچر کی ضرورت ہے

(ہ) مذکورہ ممالک کے مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ کے لیے انگریزی زبان میں بڑے وسیع دینی لٹریچر کی ضرورت ہے لیکن حال یہ ہے کہ انگریزی میں قرآن کریم کی کوئی ایک تفسیر بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کے بارے میں آنکھ بند کر کے لوگوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا جاسکے۔ اسی طرح روزمرہ کے دینی اور فقہی مسائل پر مشتمل کوئی ایسی مستند کتاب اب تک تالیف نہیں ہوئی جو ان لوگوں کو دین کی تعلیمات سے ٹھیک ٹھیک روشناس کراسکے۔ اس وقت یا تو چند گنی چنی اردو کتابوں کے تراجم ہیں جن کی صحت کی بھی کوئی ضمانت نہیں یا پھر اہل باطل کا فراہم کیا ہوا لٹریچر ہے جسے لوگ چاروناچار پڑھنے پر مجبور ہیں۔ ان مسلمانوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرانا اور ان کے دین وایمان کی حفاظت علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے، جو انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔

(و) موجودہ صنعتی دَور نے تجارت ومعیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی صورتیں پیش آتی ہیں ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروجہ کتب میں اس لیے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار

ہیں اوران کا تصور پہلے نہیں ہوسکتا تھا۔ان صورتوں کو سمجھ کران کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے اور یہ کام اسی وقت ٹھیک ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو ان کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں اور اس کے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں۔اب تک ہوتا یہ آیا ہے کہ صورتِ مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے، اسی کے مطابق جواب چلا جاتا ہے،لیکن مستفتی چونکہ عالم نہیں ہوتا اس لیے بسا اوقات وہ اپنی لاعلمی کی بناء پر صورت مسئولہ کے وہ اہم اجزاء جن پر جواب کا دارومدار ہوتا ہے، بیان نہیں کر پاتا اس لیے جواب مختلف ہوجاتا ہے۔ اور یہ بھی صرف ان معاملات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں تاجر کے دل میں کوئی شبہ اوراس کی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہوجائے ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے جن کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا یا استفتاء کا تقاضا پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جس طرح حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بازاروں میں گھوم پھر کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے ازخود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدون کرجائیں اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں، موجودہ دور کے اہل علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہل عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں۔اس کے بعد حسبِ ضرورت تصنیف وتالیف اور فتوی کے ذریعے ان معاملات کا شرعی حکم امت پر واضح کریں۔اس غرض کے لیے معاشیات کا اتنا علم جس سے اہل عصر کے معاملات اوران کے تجارتی مسائل کا علی وجہ البصیرۃ علم ہوسکے، ایک عالم دین کے لیے ضروری ہوگیا ہے۔

(ز) اس وقت جدید معاشی اور سیاسی نظریات نے پوری دنیا کو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا ہے۔اسلامی ممالک بھی عملاً انہی میں سے کسی نہ کسی کیمپ کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہر پسماندہ یا ترقی پذیر ملک ان دونوں کی آویزش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔سرمایہ داری، اشتراکیت اور سیکولر سیاسی نظریات مسلمانوں کے درمیان اپنے افکار کے پرچار اور مسلمانوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔اس صورت حال کا مقابلہ علماء ہی کے فرائض میں داخل ہے کیونکہ وہی دین کا پورا تحفظ کرتے ہوئے مسلمانوں کو صحیح راہ عمل بتا سکتے ہیں لیکن اس غرض کے لیے ان تمام نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔

(ح)اس وقت عالم اسلام میں رفتہ رفتہ یہ شعور جڑ پکڑ رہا ہے کہ ہم نے جدید عصری علوم کو مغربی قالب کے ساتھ جوں کا توں اپنا کر کس قدر سنگین اجتماعی غلطی کی ہے، چنانچہ اب یہ آوازیں تقریباً ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں کہ ان علوم کو اسلامی رنگ میں رنگ کر اپنے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانا چاہیے اور ان علوم کی نصابی اور تحقیقی کتابوں میں اسلامی تعلیمات، علماء اسلام کے افکار اور ان کی خدمات کو اس طرح سمونا چاہیے کہ اس سے مغربی افکار کی بالادستی ختم ہو جائے۔ اس غرض کے لیے اب عالم اسلام میں جگہ جگہ مختلف علوم کے تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔ ان مراکز میں ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جو دین کا وسیع و عمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ موضوع سے بھی کما حقہ واقف ہوں اور چونکہ راسخ الفکر علماء میں ایسے لوگ کمیاب بلکہ نایاب ہیں، اس لیے ان مراکز میں وہ ذہن پہنچ رہا ہے جو دین کی صحیح بصیرت نہیں رکھتا۔

ان مراکز کے اثرات ونتائج جلدی تو ظاہری نہیں ہوں گے لیکن دس بیس سال میں ان کے نتائج پوری طرح منظر عام پر آجائیں گے اور علوم عصریہ کی تمام درسگاہوں میں انہی کی تحقیقات سکہ رائج الوقت بنیں گی لہٰذا ان مراکز کی صحیح تحقیقی رہنمائی کا فریضہ بھی علماء دین پر عائد ہوتا ہے جس کے لیے متعلقہ موضوعات سے فی الجملہ واقفیت ناگزیر ہے۔

یہ تمام کام جن کی ضرورت واہمیت سے شاید ہی کوئی دردمند اور سلیم الفکر مسلمان انکار کر سکے ایک دو یا چند افراد کے بس کے نہیں ہیں اور نہ یہ ساری ضروریات کسی مختصر مدت میں پوری ہو سکتی ہیں، اس کے لیے ایسے پختہ کار، راسخ الفکر اور ذی استعداد علماء کی پوری کھیپ درکار ہے جو اپنی اپنی طبعی مناسبت کے لحاظ سے اپنے لیے کام کے مختلف دائرے تجویز کرے اور ان دائروں میں شب وروز محنت کر کے یہ قرضہ چکائے، مگر اس سارے کام کی بنیاد دینی مدارس ہی میں فراہم کرنی ہوگی۔

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ دینی مدارس میں ان مضامین کی تدریس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام مضامین کے متخصصین پیدا کرنے مقصود ہیں اور نہ یہ تاثر درست ہے کہ ان مضامین کی تدریس کے لیے کوئی بہت زیادہ وقت صرف کرنا ضروری ہوگا۔ اس لیے کہ

بفضلہٖ تعالیٰ درس نظامی کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس نصاب کو قرار واقعی طور پر پڑھ لے، اس کا ذہن مثبت اور علمی فکری باتوں کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا ادراک بہت جلد کر لیتا ہے جسے سمجھنے میں دوسرے لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے۔ اس لیے اگر دینی مدارس کے طالب علم کو انگریزی زبان کے ساتھ مذکورہ بالا چند مضامین کی بنیادی واقفیت حاصل ہو جائے تو وہ ضرورت کے وقت، ان شاء اللہ، اس بنیاد پر عمارت خود کھڑی کر سکے گا، اس لیے ان مضامین کی تدریس کے لیے بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہمارے نزدیک موجودہ دور میں علماء کی خدمات اور ان کی کوششوں کو مؤثر بنانے اور ان کا دائرہ اثر بڑھانے کے لیے مذکورہ بالا اقدامات نہایت ضروری ہیں، لیکن (اور یہ ’’لیکن‘‘ بھی ہمارے نزدیک بے حد اہمیت رکھتا ہے) ان اقدامات سے پہلے یا ان کے ساتھ ساتھ اس بات کا پورا اطمینان ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اتباعِ سنت کا وہ مزاج و مذاق جو ان مدارس کی اصل روح اور ان کی سب سے قیمتی متاع ہے، اسے کسی بھی مرحلے پر ادنیٰ ٹھیس نہ لگے۔ اس مزاج و مذاق کے بارے میں ہم اپنی گزارشات اسی مضمون کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں اور اس کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے کیونکہ اس کو مجروح کر کے جو کام بھی کیا جائے گا وہ ان مدارس کو تباہی کی طرف لے جائے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جن مضامین کے اضافے کی تجویز سابقہ صفحات میں پیش کی گئی ہے وہ اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب ان مدارس کے اصل علوم عالیہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ کے معیار تعلیم میں نہ صرف یہ کہ کوئی ادنیٰ خلل یا نقص واقع نہ ہو، بلکہ ان کے معیار تعلیم کو مزید مضبوط اور مستحکم بنایا جائے۔

عصری مضامین کے لیے راسخ الفکر اساتذہ مقرر کیے جائیں

ان دونوں ناگزیر شرطوں کے پیش نظر ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جن عصری مضامین کو داخل نصاب کیا جائے، ان کے لیے ایسے پڑھانے والے تلاش کیے جائیں جو اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے دینی مدارس سے فکری اور عملی طور پر پوری طرح ہم آہنگ ہوں اور اپنی تدریس کے دوران طلبہ کا ذہن ان مضامین کے مقصد تدریس کے لیے تیار کرتے رہیں۔

اس غرض کے لیے اگر مدارس کو اپنے بعض اساتذہ کو رخصت دے کر تیار کرنا پڑے تو اس میں بھی چنداں حرج نہیں اور ظاہر ہے کہ مضامین کا یہ اضافہ بتدریج ہی مناسب ہوگا، اس لیے اگر ایک مرتبہ اصولی طور پر مذکورہ بالا مقاصد کی تحصیل کی طرف توجہ ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کے مناسب وسائل، ان شاء اللہ فراہم ہوتے جائیں گے۔

(۷) منطق اور فلسفہ کے مضمون کو صرف ضروری حد تک پڑھانا چاہیے

نصاب سے متعلق ساتویں بات منطق اور فلسفے کی تعلیم سے متعلق ہے۔ بعض حضرات یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین کو پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں۔ ان مضامین کی اہمیت کے لیے تنہا یہ بات بھی کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ بالخصوص اصول فقہ، انہی علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز واسلوب پر مشتمل ہے۔ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے منطق اور فلسفے کی واقفیت ضروری ہے۔ آج ''تفسیر کبیر'' جیسے دریائے علم سے استفادہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفے کا علم رکھتا ہو۔ لہٰذا ان مضامین کو یکسر ختم کر دینا ہمارے نزدیک سخت نقصان دہ ہوگا، لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہیے جس حد تک وہ اسلامی علوم کے لیے زینے کا کام دیں۔ ان کو ایک مستقل علمِ مقصود کے طور پر پڑھنے پڑھانے کا واقعی اب کوئی جواز نہیں، لہٰذا جہاں ان مضامین کی تعلیم مذکورہ ضرورت سے زائد ہو رہی ہو وہاں اس کی ضرورت کی حد تک محدود کر کے دوسرے مضامین کے لیے گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ میں عنصریات اور فلکیات کے جو حصے اب تحقیق اور مشاہدے سے غلط ثابت ہو چکے ہیں ان کی غلطی پر تنبیہ کے ساتھ جدید تحقیقات پڑھانا ضروری ہے جس کے لیے علامہ نجیب رحمۃ اللہ علیہ کی ''توفیق الرحمٰن''، علام آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کی "مادل علیه القرآن" اور مولانا محمد موسیٰ صاحب کی ''جدید فلکیات'' سے مدد لی جاسکتی ہے۔

(۸) دورۂ حدیث کو دو سالوں میں منقسم کر دینا چاہیے

نصاب کے سلسلے میں آخری گزارش یہ ہے کہ قوی کے مسلسل انحطاط اور مسائل کی

پیچیدگیوں کی بنا پر عرصے سے یہ بات محسوس ہورہی ہے کہ دورۂ حدیث کے لیے ایک سال کی مدت ناکافی ہے اس مختصر وقت میں حدیث پاک پڑھنے پڑھانے کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور عموماً ہوتا یہ ہے کہ حدیث کے صرف معدودے چند ابواب تحقیق و تفصیل کے ساتھ ہو پاتے ہیں کہ سال ختم ہونے لگتا ہے اور اس کے بعد کے حصے تکمیل نصاب کی بھاگ دوڑ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ صحیح بخاری ہی کو لے لیجیے۔ استاذ اور شاگرد شب و روز مثالی محنت کرنے کے باوجود آخر سال میں انتہائی بھاگ دوڑ پر مجبور ہو جاتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے رواروی میں گزار دیا جائے۔

اسی طرح دورۂ حدیث کی بعض انتہائی اہم کتب مثلاً طحاوی شریف اور موطائین اسی وقت کی قلت کی بنا پر اکثر برائے نام ہوتی ہیں، حالانکہ ان کو اہتمام کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر دورۂ حدیث کو دو سالوں پر منقسم کر دیا جائے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ علمِ حدیث کے ساتھ مطلوب مناسبت پیدا ہو سکے گی اور طالب علم حدیث کے تمام ابواب علی وجہ البصیرۃ پڑھ سکے گا اور اس کے ساتھ اصولِ حدیث کی کوئی معیاری کتاب مثلاً ''تدریب الراوی'' یا ''فتح المغیث'' وغیرہ بھی اہتمام کے ساتھ ہو سکے گی جو ایک حدیث کے طالب علم کے لیے ازبس ضروری ہے۔

یہ چند تجاویز جو اہل علم کی خدمت میں طالب علمانہ طور پر برائے غور پیش خدمت ہیں، وفاق کی سابقہ نصاب کمیٹی جس نے سال گزشتہ نصاب میں کچھ ترمیمات یا اضافے کیے تھے، اس نے انہی خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی معادلہ کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اس لیے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اس تمام کاروائی کا مقصد معادلہ ہے۔ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ صرف معادلہ کے نقطۂ نظر سے مدارس کے نصاب و نظام میں ترمیم ہماری رائے میں کسی طرح درست نہیں البتہ ایک عالم کی حقیقی ضروریات اور اس کی خدمات کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے مندرجہ بالا تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ نصاب کے بعد کچھ باتیں انداز تدریس وغیرہ سے متعلق بھی عرض کرنے کا خیال تھا، لیکن یہ گزارشات بھی اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود اندازے سے کہیں زیادہ طویل ہوگئیں، اس لیے ان کو کسی اور صحبت کے لیے ملتوی رکھتے ہوئے فی الحال اتنے ہی پر اکتفاء کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ

تجاویز اور عرض کی گئی ہیں ان میں دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اپنے دل کی بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر بات درست ہو لیکن اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرنے کا منشاء ہی یہ ہے کہ ان میں سے جو بات دلائل کی رو سے درست ہو اس پر کوئی عملی قدم اٹھایا جائے اور اگر دلائل سے کسی بات کی غلطی واضح ہو جائے تو اسے ردّ کر دیا جائے لیکن اس موقع پر جبکہ ''وفاق المدارس'' نصاب کے مسئلے پر غور کر رہا ہے اور یہ غور بار بار نہیں ہوتا، اتنی امید ضرور ہے کہ مذکورہ بالا نکات میں سے ہر نکتے پر اطمینان اور ٹھنڈے دل سے غور ضرور کیا جائے۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ○ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

بقیہ: سکولوں میں قرآن حکیم کی تدریس

۳۔ ماہرین سے مدد: کئی ماہرین تعلیم اور بیوروکریٹ جو ریٹائر ہو چکے ہیں، اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ ان سے اپیل کی جاسکتی ہے کہ رضائے الٰہی کے لیے اپنی مہارت، وقت اور پیسہ نیشن بلڈنگ کے اس کام میں لگائیں۔

۴۔ والدین کو ترغیب: والدین سے درخواست کی جائے کہ وہ قرآن فہمی کے لیے فیس کی مد میں اضافے کو خوشی سے قبول کریں۔ اس مد میں جمع شدہ رقم کا الگ حساب رکھا جائے، فول پروف آڈٹ کیا جائے اور والدین کو دکھایا جائے جس سے تعلیمی نظام پر قوم کا اعتماد بڑھے گا۔

قرآن حکیم کی تعلیم بلاشبہ بہت بڑا کام ہے جو قومی تعمیر نو کا نقطہ آغاز بن سکتا ہے لیکن اس کی طرف عدم توجہی ساری محنت کو ضائع کر رہی ہے۔ التماس ہے کہ مناسب پلاننگ کر کے اس نیک کام کو اجر و ثواب کی نیت سے کیا جائے۔　　　والسلام،

سلیم طارق لون۔ ریٹائرڈ آئی جی پی　(فون 0300-5193678)

شمس الحق اعوان　(فون 0300-8503591)

تعلیم و تربیت

پروفیسر محمد رضوان الحق و محمد ابراہیم [1]

نیشنل کریکلم کونسل کے ثانوی جماعتوں کے نصاب کے حوالے سے

تجاویز برائے قومی نصاب

پس منظر

وفاقی وزارتِ تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت، حکومت پاکستان کی جانب سے ایک مجوزہ مسودہ برائے قومی نصاب از جماعت 9 تا 12 کے لیے اساتذہ، عوام، والدین، طلبہ اور ماہرین تعلیم سے تجاویز مانگی گئی ہیں۔ قبل ازیں ۲۰۲۰-۲۱ء میں پاکستان تحریکِ انصاف کے دورِ حکومت میں یکساں قومی نصاب (Single National Curriculum) کے حوالے سے بھی سفارشات طلب کی گئی تھیں اور بڑی تعداد میں لوگوں نے دلچسپی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن شومئ قسمت کہ مطلوبہ ہدف حاصل نہ ہوا اور عامۃ الناس تا حال منتظرِ فردا ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصے سے ہمارا نظامِ تعلیم استعماری قوتوں کے زیرِ تسلط ہے۔ تعلیمی نصابات کی تشکیل و تکمیل اور ان کے لوائحۂ عمل میں تغیر و تبدل بھی انھی کی ایما پر وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ انھی استعمار پسند طاقتوں کے مرغانِ دست آموز اور حاشیہ نشینوں کو تعلیم جیسے حساس اور اہم ترین شعبے میں اعلیٰ ذمہ داریوں پر فائز بھی کر دیا جاتا ہے۔ ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد تو ہوا لیکن تعلیمی و نصابی فیصلوں میں ابھی تک ہماری حیثیت ایک آزاد، خود مختار اور توانا قوم کی نہیں ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے حکمرانوں نے لارڈ میکالے کے دیے ہوئے نظامِ تعلیم کو نہ صرف نافذ کیا بلکہ اسے دوام بھی بخشا۔ لارڈ میکالے نے اپنی تعلیمی سفارشات (1835ء) میں اپنے خُبثِ باطن کا اظہار علی الاعلان کیا تھا اور پُرزور سفارش کی تھی کہ: ''انگریزی بولنے والے ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، انہیں تعلیمی اداروں میں اچھی مراعات کے ساتھ ساتھ پُرکشش ملازمتیں بھی دی جائیں، ہندوستان کے روایتی نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کر کے انگریزی اور صرف انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم و تدریس بنایا جائے، تعلیم کا اصل مقصد یورپی ادب اور مغربی سائنس کا فروغ قرار دیا جائے، سرکاری خزانے کی رقوم کا ایک بڑا حصہ

[1] ڈپٹی ڈائریکٹر، نیشنل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشن (نافع) منصورہ، لاہور

صرف انگریزی ذریعۂ تعلیم پر ہی خرچ کیا جائے جبکہ سرکاری ملازمت کے دروازے صرف ان لوگوں کے لیے کھولے جائیں جو انگریزی تعلیم سے آراستہ ہوں''۔ بقولِ شاعر ؂

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں مَیں

نصابی و تعلیمی تبصرات و تجزیات کے عمیق مطالعے کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ چشم کُشا حقیقت طشت از بام ہوئی کہ وطنِ عزیز میں لارڈ میکالے کا نظامِ تعلیم جوں کا توں رائج ہے اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی رہا۔ یکساں نصابِ تعلیم کے برعکس طبقاتی نصابِ تعلیم رائج ہے۔ نصاب سے اسلامی تعلیمات کو کم کرنے کی کوششیں مسلسل جاری رہیں۔ جہاد اور غزوات کے تذکرے اور شجاعت و عزیمت کے باب بھی نصاب سے متواتر خارج کیے جاتے رہے۔

مسلمان سائنس دانوں، اسلامی سوچ رکھنے والے ادیبوں اور مسلم مشاہیر کو نصاب سے نکالا گیا۔ نااہل لوگوں کو شعبہ تعلیم میں اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ رٹابازی سے ذہانت کا تعین کیا جانے لگا۔ طبقاتی نظام کی پشت پناہی کی گئی۔ اٹھارہویں ترمیم کے اِطلاق سے نصابی مرکزیت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ صوبوں کو نصاب سازی اور قانون سازی میں کھلی آزادی دے دی گئی، جس کے نتیجے میں پی ٹی آئی حکومت کے متعارف کردہ سنگل نیشنل کیریکولم کو صوبائی حکومت سندھ نے مسترد کر دیا اور قدیم انگریزی آماج گاہوں کے جدید کماؤ اور موقع پرست دانش وروں نے بھی اس غیر نظریاتی نصاب کو منہ لگانے سے اِنکار کر دیا۔

لازم ہے کہ نصابِ تعلیم سے پہلے نظامِ تعلیم کو یکساں بنایا جائے، مرکزیت کو بحال کیا جائے اور O وA لیول پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ بانی پاکستان اور آئین پاکستان نے اس بات کو بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ پاکستان ایک نظریہ "لا الٰہ الا اللہ" کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے۔ یہاں کوئی قانون یا پالیسی قرآن و سنت سے متصادم نہیں بنے گی۔

اس کی تشریح آئین کے آرٹیکل نمبر 31 میں اس طرح ہوئی ہے: ''پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لیے اور انھیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے

اقدامات کیے جائیں گے، جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنتِ نبوی کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں''۔ ہر حکومت کے لیے آئین کی پاسداری ایک قومی اور اَخلاقی فریضہ ہے۔

مجوزہ نصاب (جماعت 9 تا 12) کے جائزے کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آئین کے تقاضوں کو پورا کرے گا۔ نیشنل کریکولم کونسل اسلام آباد میں غیر ملکی این جی اوز کی سرپرستی میں لبرل اور آزاد خیال ماہرینِ تعلیم کو یہ کام تفویض کیا جاتا ہے کہ سوشل سائنسز کے مختلف مضامین کی درسی کتب سے اسلام، نظریۂ پاکستان اور ہماری معاشرت اور اَخلاقی اَقدار سے متعلقہ نِکات کو یا تو نکال دیا جائے یا انھیں کمزور کر دیا جائے۔ عیسائی مشنریز بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ انھوں نے اُردو اور انگریزی کی درسی کتب سے اسلام کی اَخلاقی اَقدار اور تاریخی حوالوں کو نکلوانے کے لیے سپریم کورٹ میں ایک اپیل بھی دائر کر رکھی ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں موجود ماہرینِ تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ آنکھیں کھلی رکھیں اور یہ جائزہ لیتے رہیں کہ اسلام آباد میں مٹھی بھر لوگ کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ صوبوں کے شعبہ ہائے نصاب و نصابی کتب میں تعینات ماہرینِ تعلیم ان سازشوں کے سدباب کے لیے ضروری اقدامات کریں۔

2020ء میں یکساں قومی نصاب (ابتدائی تا پانچویں جماعت) پر اٹھائے گئے اعتراضات کا اِزالہ کرنے کی بجائے وہی خدشات موجودہ مجوزہ قومی نصاب پاکستان (جماعت 9 تا 12) میں دہرائے گئے ہیں مثلاً اسلامی تعلیمات کو نہ صرف اسلامیات تک محدود رکھا گیا بلکہ اسلامیات کے مضمون میں اسلامی مواد کو بہت کم کر دیا گیا ہے۔ ایمانیات، عبادات اور اَخلاقیات کو محض سرسری طور پر شاملِ نصاب کیا گیا ہے تاہم جہاد اور غزوات سے متعلقہ آیات اور احادیث شامل نہیں ہیں اور سائنسی مضامین سے اسلام کی روح کو سرے سے ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ ماضی کے برعکس مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حالیہ مجوزہ نصاب مشرف دور کے 2006ء میں غیر ملکی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے تیار کردہ نصابِ تعلیم کا ہی تسلسل ہے، جسے معمولی کمی بیشی کے ساتھ پاکستانی عوام پر مسلط کیا جارہا ہے جو عوامی امنگوں کے صریحاً خلاف ہے تاہم ابھی وقت ہے کہ ہم اپنا قبلہ درست کر سکتے ہیں۔

تجاویز: قومی نصاب پاکستان 2023ء، نویں تا بارہویں

مجوزہ نصاب (جماعت 9 تا 12) پر اساتذۂ کرام، ماہرینِ مضامین اور پروفیسر

صاحبان کی بحث وتمحیص کے نتیجے میں درج ذیل تجاویز پیشِ خدمت ہیں:

عمومی تجاویز

۱۔ آئین کے آرٹیکل 31 کی روشنی میں نصاب کو نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اسلامی اور پاکستانی نظریات کا تحفظ کیا جائے۔

۲۔ نصاب سازی میں سیکولر، لادین، لبرل اور آزاد خیال ذہنیت کے لوگوں کی بجائے راسخ العقیدہ مسلم ماہرینِ نصابیات وتعلیمات کو شامل کیا جائے۔

۳۔ نصاب میں توحید ورسالت، جہاد وغزوات، عبادات ومعاملات، اسلامی روایات اور آخرت کے تصورات حقیقی روح کے مطابق پیش کیے جائیں۔

۴۔ قائدِ اعظم کے اِرشادات، آئین کی تشریحات اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کی روشنی میں قومی زبان اُردو کو فی الفور ذریعۂ تعلیم وتدریس بنایا جائے۔

۵۔ بیرون ملک کے کسی نصابِ تعلیم کو مِن وعَن لاگو کرنے کے بجائے ملکی اور مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے مرتب کیا جائے، محض نقالی درست نہیں۔

۶۔ نصاب سازی میں استعماری قوتوں اور غیر ملکی این جی اوز کی مداخلت کا مکمل خاتمہ کیا جائے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج کے نصابات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

۷۔ نویں اور دسویں جماعت میں عربی کو شامل نصاب کیا جائے۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں قرأت کے مقابلے کرائے جائیں اور انعامات دیے جائیں۔

۸۔ سائنسی مضامین سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کو نصاب میں لازمی جگہ دی جائے تاکہ سائنس کے میدان میں بھی طلبہ میں دلچسپی پیدا ہو۔

آرٹس مضامین (اسلامیات، مطالعۂ پاکستان، اُردو، انگریزی)

اسلامیات

* نبی اکرم ﷺ کے غزوات کا ذکر نہیں ہے۔ ناگزیر ہے کہ نصاب میں نبی

کریم ﷺ کے غزوات کو شامل کیا جائے تاکہ نسلِ نو میں جذبہ حریّت پیدا ہو۔

* جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی شامل نہیں ہیں لہٰذا انہیں ترجمہ و تشریح کے ساتھ شامل کیا جائے تاکہ تفہیم میں تسہیل کا سامان پیدا ہو۔

* نصاب میں عبادات، ایمانیات اور طہارات کا ذکر تو ہوا ہے لیکن اسلام کو بطور نظام حیات اور بطور ریاست پیش نہیں کیا گیا۔ اسلام کو نئی نسل کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ایک مفصل باب 'اسلام بطور نظامِ حیات' شامل نصاب کیا جائے تاکہ بشریات کے حقیقی تقاضے پورے ہو سکیں۔

* حرمتِ سود کو نصاب کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ جہاں زکوٰۃ وصدقات کا تذکرہ ہے، وہاں حرمتِ سود پر بھی مفصل مضمون دیا جانا چاہیے تاکہ سود کی لعنت سے طلبہ وطالبات کو واقفیت حاصل ہو۔ نصاب میں مجوزہ ہفتے میں اسلامیات کے دو یا تین پیریڈ کی بجائے پورے ہفتے میں روزانہ ایک پیریڈ لازم قرار دیا جائے تاکہ بچوں میں اسلام کے نظریات جڑ پکڑ سکیں۔ پیریڈ زر اوقات کے حوالے سے افسانوں کو سیرت نگاری پر ترجیح دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

* سیرت النبی ﷺ اور انبیائے کرامؑ کے حالات و واقعات کو بہت کم جگہ دی گئی ہے۔ 'حق بہ حق دار رسید' کے مصداق اس امر کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔

مطالعۂ پاکستان

* اخلاقیات پر الگ سے ایک باب شامل کیا جائے تاکہ طلبہ وطالبات میں جذبہ حب الوطنی اُجاگر ہو۔ اخلاقیات، قیامِ امن کے لیے نسخۂ کیمیا ہے۔

* خارجہ پالیسی کے معاشی اثرات و مُضمرات کی اہمیت پر بھی ایک مضمون شامل کیا جائے۔ پاکستان کی معاشی تاریخ پر ایک مضمون مختلف رنگین چارٹس اور تصاویر کی صورت میں شامل نصاب کیا جائے تاکہ تفہیم میں تسہیل اور آسانی فراہم ہو سکے۔ ویسے بھی آج کل استعماریت، معیشت پر منحصر ہے۔

* مقتدرہ قومی انتظامیہ برائے آفات(National Disaster

(Management Authority) کی ذمہ داریوں کو شامل نصاب کیا جائے تا کہ قدرتی آفات جیسے گلوبل وارمنگ اور موسمی تبدیلیوں کے بارے میں کامل آگاہی میسر آسکے اور طلبہ و طالبات جدید مسائل سے متعارف ہو سکیں۔

* نصاب میں نظریۂ پاکستان کے حوالے سے سرسید احمد خاں کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے رفقائے کار کی خدمات کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے۔

* اسلامی تہواروں مثلاً عید الفطر، عید الضحیٰ اور رمضان المبارک کو بھی نصاب میں شامل کیا جائے تا کہ طلبہ و طالبات میں مذہبی اور دینی شعور اُجاگر ہو۔

* انسانی حقوق کے ضمن میں انجمن اقوام متحدہ کے منشور کے ساتھ ساتھ میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ کو بھی انسانی حقوق کے حوالے سے شامل کیا جائے۔

* مشرف دور کی روشن خیالی کے بارے میں دیا گیا باب فی الفور نصاب سے خارج کیا جائے اور اس ضمن میں تمام نصاب کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔

* 'غیر ملکی تنظیمات (NGOs) کا کردار، اور آبادی پر قابو پانے رفیملی پلاننگ جیسے حوالوں کو نصاب سے خارج کیا جائے اور اسلامی تصور کو اجاگر کیا جائے۔

اُردو

* افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ ایک شعبہ اسلامی ادب کا بھی ہونا چاہیے۔ سیرت نگاری کو غیر افسانوی ادب میں شامل کرنے کی بجائے اسلامی ادب کا حصہ بنانا جائے۔ اسلامی ادب میں ہم حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، سلام اور دیگر اصنافِ نظم و نثر کا بخوبی احاطہ کر سکتے ہیں۔

* سیرت نگاری کے مضامین عموماً افسانوں کی نسبت طویل ہوتے ہیں مگر نصاب میں دیے گئے تین افسانوں میں ہر افسانے کے لیے ہفتہ وار تین تین دن (کل 9 دن) رکھے گئے ہیں جب کہ سیرت نگاری کے لیے ہفتے میں صرف دو دن رکھے گئے ہیں۔ افسانہ چونکہ آدھے گھنٹے کی مختصر تحریر ہوتی ہے اس لیے ہر افسانے کے لیے ہفتے میں تین دنوں کی بجائے دو دن

مختص کیے جائیں اور سیرت نگاری کے لیے دو دن کی بجائے تین دن رکھے جائیں۔

* پریم چند ایک ہندو افسانہ نگار ہے جب کہ سعادت حسن منٹو مسلمان ہونے کے باوجود اپنے جنسی افسانوں کے باعث شہرت رکھتا ہے لہٰذا ان دونوں کو نصاب سے خارج کیا جائے اور غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر امجد طفیل اور دیگر پاکستانی افسانہ نگاروں کے افسانے شاملِ نصاب یے جائیں۔

* بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی کتاب ''چند ہم عصر'' خاکوں کی بہترین کتاب ہے۔ خاکوں کے انتخاب میں محسنِ اردو ہی سے اِستفادہ کیا جانا چاہیے۔

* پطرس بخاری کے دو مجوزہ مضامین (ہوسٹل میں پڑھنا، میبل اور میں) گزشتہ کئی دہائیوں سے شامل نصاب چلے آ رہے ہیں۔ پطرس بخاری کی کتاب ''مضامین پطرس'' سے مذکورہ دو مضامین کے علاوہ دیگر مضامین بھی قابلِ انتخاب ہیں۔ موصوف صرف ان دو مضامین کے ہی مصنف نہیں ہیں۔

* بے مقصد سفر ناموں کی جگہ حج، عمرہ اور مذہبی مقامات کے سفر ناموں کو شامل نصاب کیا جائے تا کہ نئی نسلِ نو میں دینی حمیت کا اِحیا ممکن ہو سکے۔

* دلاور فگار کی مجوزہ نظم 'کرکٹ اور مشاعرہ' میں دونوں کے مابین بظاہر کوئی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی لہٰذا اس نظم کی بجائے عنایت علی خاں، انور مسعود، انعام الحق جاوید اور سرفراز احمد خاں مرحوم کی کوئی مزاحیہ نظم شاملِ نصاب کی جائے جو عصری مزاح کی ادبی پختگی کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہو۔

* ناصر کاظمی مرحوم کی شاعری محض میر تقی میر کی نقالی ہے اور نوشی گیلانی بطور زندہ شاعرہ ابھی تک اپنا مقام متعین نہیں کر پائی ہیں۔ ان دونوں کی غزلوں کی بجائے قدیم اساتذہ کی نظمیں اور غزلیں شامل کی جائیں۔ یاد رہے کہ قیام پاکستان سے لے کر بھٹو دور تک کے تیس برسوں میں صرف مرحومین ہی کی شاعری شاملِ نصاب کی جاتی تھی۔ یہ ایک اچھی روایت تھی اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ انتخاب استحقاق کا طالب ہے نہ کہ موقع پرستی کا۔

* حصۂ غزلیات میں عشق مجازی کی بجائے عشق حقیقی پر مبنی غزلیات زیادہ سے زیادہ

شامل نصاب کی جائیں تا کہ بچوں کی نظریاتی تربیت کا اہتمام ہو سکے۔

* مستنصر حسین تارڑ کے افسانے معلومات افزا اور سبق آموز ہوتے ہیں اور افسانوں کے انتخاب میں انہی کے افسانے ہی معیار پر پورا اترتے ہیں۔

* علامہ اقبال نے بہت اچھی غزلیں لکھی ہیں لیکن مجوزہ نصاب میں ان کی کوئی غزل شامل نہیں۔ کسی جماعت میں انھیں بطور غزل گو بھی شامل کیا جائے۔

مزید برآں علامہ اقبال پر کسی جماعت میں کوئی مضمون نثر میں شامل نہیں۔ وہ ایک مسلمہ نثر نگار بھی ہیں لہٰذا کسی جماعت میں نثری مضمون بھی شامل کیا جائے۔

انگریزی

* انگریزی کا مجوزہ نصاب غیر ملکی نصاب کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے جو ہمارے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کرام کی ذہنی سطح سے مطابقت نہیں رکھتا۔ نصاب کو سہل انداز میں پاکستانی اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی استعداد کے مطابق ترتیب دیا جائے تا کہ مغربی تہذیب کی بجائے اسلامی تمدن نمایاں ہو۔

* مجوزہ نصاب میں جو ناول، افسانے اور نظمیں دی گئی ہیں، وہ اکثر و بیشتر مغربی مصنفین کی ہیں، جن میں یورپی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے جو ظاہر ہے اسلامی اور پاکستانی تناظر سے موافقت نہیں رکھتیں اور فکری انتشار کو جنم دیتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزی مضمون کی روح اسلامی تصورات اور معاشرتی اَقدار سے متصادم نہ ہو۔ مسلم تخلیق کاروں کی تخلیقات شاملِ نصاب کی جائیں تا کہ مسلم امہ فکری انتشار سے محفوظ رہے۔

* مجوزہ نصاب میں مارٹن کنگ لوتھر اور بارک اُبامہ کو بطور ہیرو اور دانشور پیش کیا جانا، ہماری روایات سے لگا نہیں کھاتا لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کی روشنی میں ہی شخصیات کو شامل کیا جائے۔ اس ضمن میں محمد اسد اور احمد دیدات جیسے مسلم مفکرین کی انگریزی تحریروں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

* مجوزہ انگریزی نصاب میں مستعمل زبان نہایت دقیق اور ثقیل ہے۔ ہماری شرح

خواندگی میں کمی کا اہم ترین محرک میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور گریجوایشن کی سطح پر انگریزی کا بطور لازمی مضمون ہونا ہے، جس کی وجہ سے لاکھوں پاکستانی طلبہ وطالبات اس مضمون میں فیل ہو جاتے ہیں لہٰذا اس مضمون کی لازمی حیثیت ختم کر کے اسے اختیاری درجہ دیا جائے۔اس اقدام سے ایک طرف تو شرح خواندگی میں اضافہ ہوگا اور ہمارا ملک دنیا کے تعلیم یافتہ ممالک میں شمار ہوگا جب کہ ہمارے ہونہار طلبہ وطالبات بھی رٹا بازی کے اعصاب شکن اور نفرت انگیز عمل سے چھٹکارا پالیں گے تو دوسری طرف تفہیم کے در وا ہوں گے اور عالم اسلام میں ایجادات کا رکا ہوا سلسلہ از سر نو بحال ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ فرانس، روس، جرمنی، جاپان، کوریا اور ترکی میں انگریزی کو لازمی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ محض اختیاری درجہ حاصل ہے۔ ہمیں بھی آزاد اور خود مختار ممالک کے سے انداز و اطوار اپنانے ہوں گے تاکہ ہم دو صدیوں پر محیط ذہنی غلامی سے نجات پا سکیں۔مزید برآں یہ کہ ہمارے طلبہ کی بنیادی ضرورت روزمرہ میں استعمال ہونے والی سپوکن اور فنکشنل انگلش ہے نہ کہ لٹریری انگلش۔فی زمانہ طلبہ انگلش لٹریچر کی بجائے انگلش لنگوسٹک کو ترجیح دے رہے ہیں، جس کی فی الحال ضرورت زیادہ ہے۔

* 1964ء میں ہندوستان میں اولیول اور اے لیول کو ختم کر دیا گیا تھا تاکہ ان امتحانات کی داخلہ فیس کی مد میں ہندوستانی سرمایہ دوسرے ممالک کو منتقل نہ ہو اور اس طرح زرِ کثیر کا ضیاع نہ ہو۔اس تناظر میں پرزور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں بھی اولیول اور اے لیول کو ختم کر دیا جائے تاکہ پاکستانی سرمائے کی بیرون ملک منتقلی کو روکا جا سکے۔ایسا کرنے سے ہمارے اعلیٰ دماغ جو ملک سے فرار ہو جاتے ہیں، ان کی تعداد میں کمی آئے گی۔

* لسانیات کے نصاب میں ایک معیاری مشق (Standard Practice) یہ ہے کہ نصابی کتب کی تدوین کے لیے نصاب میں موضوعات اور ذیلی موضوعات (Themes and Sub-themes) کی فہرست دے دی جاتی ہے تاکہ مصنفین ان کو سامنے رکھتے ہوئے نصابی کتب مدون کر سکیں لیکن مارچ 2023ء کے اس مجوزہ نصاب میں انگریزی کے لیے یہ طریقہ اپنانے کی بجائے غیر ملکی مصنفین اور ان کی نظموں، ناولوں اور افسانوں کا تعین کر دیا گیا ہے۔اس سے دو نقصان ہوں گے: ایک تو یہ کہ نصابی کتب کے مدوّن کرنے والوں کے

لیے کام اور گنجائش کم ہو جائے گی اور دوسرا یہ کہ مغربی تہذیب وثقافت اور ان کے اصول واقدار جبراً جز ونصاب ونصابی کتب رہیں گے، جس سے نسلِ نو پر منفی نتائج مرتب ہوں گے۔

سائنسی مضامین (فزکس، بیالوجی، کیمسٹری، ریاضی، کمپیوٹر سائنس)

* سائنسی مضامین کی کتابوں میں پہلے قرآنی آیات دی ہوتی تھیں اور وہ امتحانات کا حصہ بھی ہوا کرتی تھیں۔ مجوزہ نصاب میں قرآنی آیات کو سائنسی مضامین سے نکال دیا گیا ہے۔ اسلام اور جدید سائنس میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہزار سے زیادہ آیات سائنس سے متعلق ہیں۔ ایسی قرآنی آیات، جن کا تعلق انسان کی پیدائش اور کائنات کی تخلیق سے ہے، انھیں تو بہر صورت نصابیات کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔

* مجوزہ سائنسی مضامین کے نصاب میں مسلم سائنس دانوں کے کارنامے اور خدمات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مسلم سائنسدانوں (الخوارزمی، رازی، ابن الہیثم، ابوالقاسم زہراوی، بوعلی سینا، البیرونی، عمر خیام، الکندی، جابر بن حیان اور فارابی) نے سائنس کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس لیے اُن کو شامل نصاب ہونا چاہیے مثلاً علم حیاتیات میں بوعلی سینا کی خدمات کو کون فراموش کر سکتا ہے جن کی لکھی ہوئی طبی کتب آٹھ سو سال تک مغربی میڈیکل کالجوں میں نصاب کا حصہ رہیں۔ اسی طرح ابوالقاسم زہراوی' جراحت یعنی سرجری کو دُنیا میں متعارف کروانے والا پہلا مسلمان سرجن تھا اور اس کی کتاب ''التصریف'' دنیا میں جراحت کی پہلی کتاب ہے۔ اُنھوں نے سرجری کے لیے آلات بنائے اور انسانی آپریشن بھی کیے۔

* فزکس کے نصاب میں بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theory) کے بارے میں سائنس وضاحت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس کی وضاحت اسلامی تناظر میں ہونی چاہیے۔ سائنس نے ارتقائی عمل کی بھی غلط تشریح کی ہے اور بندر کو انسان کے آباؤاجداد میں شمار کیا ہے۔ بطور مسلمان ہمارے سائنسی نصاب میں انسانی ارتقا کے بارے میں اسلامی حوالے سے بات کی جانی چاہیے کہ انسان بندر کے ارتقا سے وجود میں نہیں آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے ذریعے انسان کی تخلیق کی ہے۔ کائنات کی پیدائش اور انسان کی آفرینش کا اسلامی موقف واضح ہونا چاہیے۔

* سائنسی مضامین کے نصابات نہایت طویل ہیں لہٰذا اُنھیں مختصر کرنے کی ضرورت ہے۔تجربہ گاہوں میں سائنسی آلات کی فراہمی کے بغیر سائنسی مضامین کو کمرہ جماعت میں پڑھا لینا کافی نہیں ہوگا۔اس ضمن میں حکومت کو بہترین تجربہ گاہیں اور سائنسی آلات بھی فراہم کرنا ہوں گے۔

* کمپیوٹر سائنس کی کونپل ریاضیات کے شجرِ سایہ دار سے پھوٹی،اس لیے مسلم ریاضی دانوں کا تذکرہ کمپیوٹر سائنس کے پہلے باب میں ہونا ضروری ہے۔کمپیوٹر سائنس کا مجوزہ نصاب بیرون ملک نصاب کی نقل ہے جو ہمارے اساتذہ اور طلبہ کے لیے خاصا مشکل ہے۔ اسے سہل ترین بنایا جائے۔

* کمپیوٹر سائنس کے نصاب میں بلومز ٹیکسانومی کے اصول وضوابط کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ثانوی بات پہلے اور بنیادی بات بعد میں کی گئی ہے۔اسی طرح مشکل بات پہلے اور آسان بات بعد میں کی گئی ہے۔نفسیاتی نقطۂ نظر سے دورِ حاضر کے معیاری اور سائنسی اسالیب کو اپنا کر ہی اعلیٰ تدریس ممکن ہے۔

* کمپیوٹر ایک عملی مضمون ہے۔ہمارے ہاں بدقسمتی سے اسّی فی صد تعلیمی اداروں میں نہ کمپیوٹر لیب ہیں اور نہ انٹرنیٹ کی سہولیات ہی میسر ہیں۔جہاں لیب ہیں'وہاں کمپیوٹرز کمیاب ہیں۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں تعلیمی اداروں میں مطلوبہ معیار کی سہولیات کا فراہم ہونا ناگزیر ہے۔

ماحصل

حاصل تحریر یہ ہے کہ درج بالا نصابی تجاویز وسفارشات متعلقہ مضامین کے اساتذۂ کرام،ماہرینِ مضامین اور پروفیسر صاحبان کی محنت شاقہ اور عمیق نظری کے بعد مرتب کی گئی ہیں جو اپنے اپنے مضمون میں ایک ربع صدی سے زائد عملی تدریس کا تجربہ رکھتے ہیں۔اربابِ اختیار سے التماس ہے کہ ان نصابی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر عمل درآمد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں تاکہ یہ مشقتِ تامہ ضائع نہ ہو۔عوام سے بھی اپیل ہے کہ بطور مسلمان اور پاکستانی اس نصابی کاوش وکوشش کو حرزِ جاں بنائیں تاکہ ہم بھی عالم اقوام اور عالم اسلام کی صف اوّل میں اپنا مقام متعین کرسکیں۔

تعلیم و تربیت

سلیم طارق لون[۱]

سکولوں میں قرآن حکیم کی تدریس

بخدمت جناب وفاقی وزیر تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت
اسلامی جمہوریہ پاکستان، اسلام آباد
السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

ہم آپ کی توجہ ایک انتہائی اہم معاملہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں مسلم لیگ ن کی حکومت نے ایک بل پاس کیا تھا جس کے محرک موجودہ گورنر پنجاب محترم بلیغ الرحمن صاحب تھے۔ بل کے مطابق یکم سے پانچویں کلاس تک ناظرہ اور چھٹی سے بارھویں جماعت تک ترجمہ کے ساتھ قرآن حکیم پڑھانا لازم قرار پایا تھا۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ اس سے متعلقہ امور کو تمام ذمہ داروں نے بڑے قومی جذبہ کے ساتھ انجام دیا اور قرآن حکیم کا ترجمہ جو نصاب تعلیم کا حصہ بن چکا ہے اس پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہو چکا ہے۔ کتب چھپ چکی ہیں اکثر سکولوں تک پہنچ چکی ہیں۔ سکیم آف سٹڈیز بھی تیار ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود یہ قومی اہمیت کا پروگرام حسب ذیل مشکلات کا شکار ہے۔

پہلی سے پانچویں کلاس تک ناظرہ تعلیم مع تجوید

اس وقت اسلام آباد میں ماڈل کالجز کی تعداد 18 اور ماڈل سکولز کی تعداد 423 ہے۔ پرائمری سکول اس کے علاوہ ہیں جو تمام کے تمام خواتین ٹیچرز کے زیر انتظام ہیں۔

۱۔ قاریہ صاحبان دستیاب نہیں ہیں: ہم نے اسلام آباد کی سطح پر سکولوں کا وزٹ کیا جس سے معلوم ہوا کہ تجوید کے ساتھ ناظرہ پڑھانے کے لیے استاد نہیں ہیں۔ پرائمری سکولوں میں کوئی قاریہ صاحبہ نہیں ہیں۔ قاریہ صاحبہ کی نئی آسامیاں پیدا کی جائیں اور ان پر قاریہ خواتین بھرتی کی جائیں۔

۲۔ پیریڈ مقرر نہیں ہے: سکولوں میں قرآنی تعلیم کے لیے الگ سے کوئی پیریڈ نہیں

[۱] آئی جی ریٹائرڈ، اسلام آباد

ہے بلکہ اسے پرنسپل کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔بعض سکولوں میں پہلے پیریڈ کے ساتھ کچھ تجوید سکھادی جاتی ہے اور بعض سکولوں میں اسلامیات کے پیریڈ میں سے کچھ وقت نکال لیا جاتا ہے۔

۳۔ ٹیسٹ کا کوئی پلان نہیں ہے: بچوں کی تجوید کا ٹیسٹ کس طرح لیا جانا ہے، اس کا کوئی پلان موجود نہیں۔

۴۔ سلیبس: قرآن حکیم کا ناظرہ مع تجوید پڑھانے کا سلیبس مقرر نہیں کیا گیا کہ کس کلاس میں کتنا پڑھانا ہے تاکہ بچوں کا پانچویں کلاس تک ناظرہ مکمل ہو۔بعض سکولوں میں پانچویں جماعت کے امتحان میں پاس مارکس 50 رکھے گئے ہیں اور بعض میں وہ بھی نہیں۔ ایک یکساں نظام بنانے کی ضرورت ہے۔

چھٹی تا بارھویں جماعت تک ترجمہ قرآن

۱۔ ترجمہ قرآن کا الگ سے کوئی ٹیچر نہیں ہے: سکولوں کے وزٹ سے معلوم ہوا کہ اس کے لیے علیحدہ سے کوئی ٹیچر نہیں ہے۔اسلامیات کے ٹیچر ہی سے کہا گیا ہے کہ وہی قرآن حکیم کا ترجمہ پڑھائیں اور وہ بھی اپنی صوابدید پر۔

۲۔ الگ پیریڈ نہیں ہے: اس کے لیے علیحدہ سے کوئی پیریڈ معین نہیں کیا گیا۔بعض سکولوں میں پہلے پیریڈ میں تھوڑا سا وقت نکال لیا جاتا ہے اور بعض سکولوں میں اسلامیات کے پیریڈ ہی سے وقت نکال لیا جاتا ہے۔ایک ہفتہ میں عام طور پر 40 پیریڈ ہوتے ہیں جن کی مناسب پلاننگ کر کے ترجمہ قرآن مجید کو ان میں شامل کیا جائے۔اسلامیات کے علاوہ ہفتہ میں کم از کم چار پیریڈ ترجمہ قرآن کو دیئے جائیں۔

۳۔ اسلامیات کے اساتذہ کو پابند کیا جائے کہ وہ ترجمہ قرآن کی کلاسز لیں: جب تک وسائل دستیاب نہیں ہوتے اسلامیات کے اساتذہ کو پابند کیا جائے کہ وہ باقاعدگی سے ترجمہ قرآن کے اہم دینی فریضہ کو سرانجام دیں۔

۴۔ ترجمہ قرآن مجید لازمی مضمون قرار دیا جائے: اگرچہ فیڈرل بورڈ نے کہا ہے کہ قرآن مجید کا امتحان لیا جائے لیکن اس کے نمبر صرف 10 رکھے ہیں۔قرآن حکیم کو لازمی

مضمون قرار دیا جائے، اس کے 100 نمبر رکھے جائیں اور پاس مارکس 60 ہوں تب بچے توجہ دیں گے۔ اسلامیات کے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ فرسٹ ائیر میں 50 نمبر لینا لازم ہے لیکن سیکنڈ ائیر میں کوئی نمبر نہیں۔ اس کے لیے کوئی واضح پالیسی بنائی جائے۔

۵۔ فیس سسٹم: بعض ماڈل سکولز مطالعہ قرآن حکیم کے لیے 300 تا 400 روپے بچوں سے فیس وصول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب کے لیے یکساں پالیسی بنائی جائے۔ تمام بچوں سے یہ فیس لی جائے اور اس سے قاری/ قاریہ کی تعیناتی کی جائے اور ان پیسوں کا الگ سے حساب رکھا جائے۔

۶۔ اساتذہ کرام کی تربیت: اساتذہ کرام کی تربیت کے لیے رضا کار تنظیموں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے، آن لائن تربیت کا انتظام بھی ہوسکتا ہے۔ اگر پلان کیا جائے تو ہم بھی ایسی تنظیمیں تلاش کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

بہتری کے لیے تجاویز

۱۔ بجٹ: اگرچہ نئی تعیناتی کے لیے بجٹ لازمی عنصر ہے لیکن ہم نے محسوس کیا ہے کہ بہت سارا کام اساتذہ کے جذبے کو بڑھانے اور انتظامی امور بہتر بنانے سے ہوسکتا ہے۔ تاہم موجودہ آسامیوں پر بھرتی کے لیے خصوصی بجٹ مختص کیا جائے تاکہ سکولوں میں اساتذہ کی کمی دور ہو سکے۔

۲۔ قومی جذبہ ابھارا جائے: معاشرے میں بے شمار لوگ ہیں جو قومی تعمیر نو کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اسلام آباد کی سطح پر سیکٹر کی بنیاد پر ایسی کمیٹیاں بنائی جائیں جو قرآن حکیم کے مطالعہ کے لیے قاری اور ٹیچرز کا انتظام کریں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ لوگوں کے چندوں پر مساجد اور مدارس کا انتظام چل رہا ہے۔ علماء حضرات چندوں کی بنیاد پر ایک مدرسہ سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا مدرسہ کھڑا کر لیتے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مخیر حضرات مالی تعاون کے لیے تیار ہیں تو کیا وہی کام سکولوں کی سطح پر نہیں ہوسکتا؟ ضرورت صرف قومی جذبہ کی ہے۔ وزارت کی اجازت سے مقامی سطح پر ایسی تعلیمی کمیٹیاں بنائی جائیں جو صرف قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے سکولوں کی مدد کریں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۳۰)

تفہیم دین پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کے موجودہ معاشی بحران کا حل
قرآن وسنت کی روشنی میں

[کامسیٹ یونیورسٹی لاہور میں اس موضوع پر سیمینار سے مدیر البرہان کا اظہارِ خیال]

۱۔ اسلام معاشی خوشحالی کا ضامن ہے۔قرآن حکیم میں قوموں/تہذیبوں کی کامیابی اور معاشی خوش حالی کا اصول یہ ہے کہ اگر لوگ اللہ پر ایمان لائیں، اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزاریں، اگر غلطی ہوجائے تو اللہ سے معافی مانگیں تو وہ انہیں دنیا میں کامیابی اور خوش حالی عطا فرماتے ہیں:

۔ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الانبیاء۲۱:۱۰۵]

''ہم نے تورات کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا تھا کہ جنت کے وارث صرف ہمارے نیک بندے ہوں گے۔''

۔ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۳:۱۳۹]

''اور تم ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، بلکہ تمہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔''

اس کا ریشنل (عقلی دلیل) یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نظریۂ حیات سے شدت سے وابستہ ہوجاتی ہے تو اس کے افراد کے اندر وہ صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہیں جیسے اخلاص، محنت کی عادت، جذبے کی فراوانی ، اطاعت امیر، تنظیم ، قانون کی پابندی، منصوبہ بندی، ایثار وقربانی وغیرہ۔ہم اپنے عقیدے سے شدید وابستگی کے اس مرکز کو شرعی زبان میں ایمان کہتے ہیں ۔ایمان مضبوط ہو تو اس کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی صورت میں نکلتا ہے اور یہی قوت عمل اور قوت اخلاق دنیا میں کامیابی اور خوش حالی کی ضمانت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا ہے کہ:

۔ ﴿وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ

مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴾ [ھود۱۱:۵۲]

''اوراے میری قوم کے لوگو! اپنے ربّ سے گناہوں کی معافی مانگو اور توبہ کرو۔ وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا تمہاری قوت میں مزید اضافہ کرے گا۔ اور دیکھو مجرم بن کر روگردانی نہ کرو۔''

۔ ﴿اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّكُمۡ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا وَّجَعَلۡنَا الۡاَنۡهٰرَ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ﴾ [الانعام۶:۶]

''کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جنہیں ہم نے زمین میں اتنی شان وشوکت دی تھی جتنی ان کو نہیں دی۔ اور ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارش برسائی اور ہم نے نہریں جاری کیں جو ان کے پاس بہتی تھیں۔ لیکن پھر ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو اٹھایا۔''

اور اگر لوگ ایمان نہ لائیں یا ایمان لا کر اعمال صالحہ نہ سرانجام دیں تو دنیا کی زندگی ان پر تنگ کر دی جاتی ہے۔

۔ ﴿وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴾ [طٰہٰ ۲۰:۱۲۴]

''اور جس نے میرے ذکر کو چھوڑا اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔''

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ امریکہ و یورپ آج کل کیوں کامیاب اور خوش حال ہیں جبکہ ان کی تہذیب کی بنیادی آئیڈیالوجی (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم وغیرہ) خلافِ اسلام ہے اور مبنی بر کفر و شرک ہے۔ یہود و نصاریٰ کی اسلام اور مسلم دشمنی قرآن حکیم نے بھی واضح کی ہے [۱] اور ہم بھی اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے

[۱] آج کل چین اور روس کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی کفر و شرک کے علمبردار اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ آج کل یہ بھی مغربی فکر و تہذیب اور اس کے نظام سرمایہ داری پر عمل کر رہے ہیں۔ ماضی میں سوشلزم کے علمبردار تھے اور اہل علم جانتے ہیں کہ سوشلزم بھی مغربی فکر و تہذیب ہی کی ایک شاخ اور اس کا پرتو ہے۔

دو بنیادی سبب ہیں:

۱۔ دنیا میں ایسی قوم/تہذیب موجود نہیں ہے جو حق کی علمبردار اور اللہ کی فرمانبردار ہو، ایمان اور عمل صالح رکھتی ہو۔ مسلم محض نام کے مسلمان ہیں۔ ان کے زوال کی بنیادی وجہ ہی یہی ہے کہ وہ ایمان کی کمزوری اور نفاق کی وجہ سے اعمال صالحہ پر قادر نہیں اور ان میں وہ صلاحیت اور اہلیت ہی نہیں جو دنیا میں کامیابی اور معاشی خوش حالی کے لیے درکار ہوتی ہے۔

۲۔ اہل مغرب اپنے کفر میں سچے ہیں۔ وہ اپنے نظریۂ حیات سے مخلص ہیں، اس سے شدید وابستگی رکھتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت بھی ان کے لیے جذبۂ محرکہ ہے لہٰذا ان کے اندر وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا ہوگئی ہے جو قطع اسباب کے لیے درکار ہوتی ہے لہٰذا وہ کامیاب اور خوش حال ہیں۔

مسلمان اگر اسلام پر ایمان لانے اور عمل کرنے میں سچے اور مخلص ہوتے تو یقیناً وہی کامیاب ہوتے لیکن جب وہ نہیں ہیں تو اللہ نے اپنی دنیا کا نظام تو چلانا ہے۔ مسلمانوں میں اگر صلاحیت نہیں تو جن کافروں میں ہے وہی کامیاب، خوش حال اور غالب ہوں گے بقول شاعر۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یہاں اگر ہم نے یہ بحث چھیڑی کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کی نشأۃ ثانیہ کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ تو ہم موضوع سے ہٹ جائیں گے جو احباب اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ہماری کتاب ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'' کا مطالعہ کریں۔ لیکن اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے اور چند جملوں میں بات کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کا نظام تعلیم وتزکیۂ نفس کمزور اور خراب ہوگیا جس نے وہ افراد پیدا کرنے بند کردیے جن کا ایمان مضبوط ہوتا، جو اعمال صالحہ پر قادر ہوتے اور ان کے اندر قطع اسباب کی صلاحیت واہلیت ہوتی۔

اس کا ایک بنیادی حل یہی ہے جس سے وہ زوال سے نکل سکتے ہیں اور کامیابی اور عروج کی طرف بڑھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے نظام تعلیم وتزکیہ کی اسوۂ نبوی کے مطابق اصلاح کریں تاکہ

ایسے افراد دوبارہ پیدا ہونا شروع ہو جائیں جیسے صدرِ اسلام میں ہوتے تھے۔اس میں اصل رکاوٹ تو ہماری داخلی ہے لیکن اب اس میں ایک خارجی رکاوٹ بھی پیدا ہوگئی ہے کہ مسلمان دو صدیوں تک مغرب کا غلام رہنے کی وجہ سے مغرب کی الحادی اور مشرکانہ فکر و تہذیب پر فریفتہ ہو گئے ہیں بلکہ اس کے فکری و عملی غلام بن گئے ہیں لہٰذا جب تک وہ اس کو رد کر کے اپنے دین و نظریۂ حیات کی طرف سنجیدہ مراجعت نہیں کرتے، وہ موجودہ زوال سے نہیں نکل سکتے۔ بلکہ ہم پر تو دُہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ہم نے پاکستان بناتے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنائیں گے اور اس میں اسلامی اصول واقدار پر عمل کریں گے لیکن ہم نے ایسا نہ کر کے اللہ سے کیے گئے عہد کو توڑا ہے اور غداری کے مرتکب ہوئے ہیں جبکہ بقول اقبالؒ

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کرتی نہیں قوموں کے گناہوں کو معاف

معاشی بدحالی کا قرآنی حل

یہ ذہن میں رہے کہ اسلام آخرت Oriented دین ہے یعنی اس میں آخرت کو دنیا پر ترجیح حاصل ہے۔ دنیا کی محبت، دولت کی حرص، اعلیٰ معیارِ زندگی کے حصول کو دنیا میں غایت بنالینا، اس میں مسابقت اور اس کے لیے ہر طرح کے جائز اور ناجائز ذرائع کا استعمال، راتوں رات امیر بننے کی خواہش، دنیا میں آسائشوں اور راحتوں کی طلب، یہ سب نہ اسلام میں مطلوب ہے نہ اس کا مقصود ہے۔ تاہم چونکہ یہ نظریۂ حیات اور نظامِ حیات بھی ہے اس لیے اس نے زندگی گزارنے کا جو لائحہ عمل دیا ہے اگر اس پر عمل کیا جائے تو معاشی خوش حالی خود بخود حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ مسلمانوں کو صدرِ اوّل میں حاصل ہوئی اور جب تک وہ (ایک ہزار برس تک) دین پر چلتے رہے انہیں حاصل رہی، اس کے باوجود کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے تیار کردہ ساتھیوں خلفاء راشدین نے کبھی معاشی خوش حالی کو ہدف بنا کر کوئی لمبی چوڑی منصوبہ بندی نہیں کی اور کبھی کوئی پانچ سالہ یا دس سالہ معاشی منصوبہ نہیں بنایا۔

نبی کریم ﷺ کے عہد میں خود آپ کے گھر کا یہ حال تھا کہ کئی کئی دن تک آپ کے ہاں چولہا نہیں جلتا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے کسی نے واقعہ افک کے حوالے سے پوچھا کہ اماں جان

کیا آپ کا وزن اُس وقت اتنا کم تھا کہ ڈولی اٹھانے والے کہاروں کو پتا ہی نہیں چلا کہ آپ اندر موجود ہیں یا نہیں؟ انہوں نے کہا: بیٹا! میں دبلی پتلی تھی، کھانے کو کیا ملتا تھا محض چند کھجوریں اور پانی۔ پھر دس پندرہ سال کے اندر حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ حال ہوگیا کہ مسجد نبوی میں زرو جواہر کے ڈھیر لگے ہوتے تھے اور آپ نے بچوں سے لے کر بڑوں تک سب کے وظیفے مقرر کردیئے (جسے ہم آج کل سوشل سیکورٹی کہتے ہیں) اور پھر خلافت راشدہ کے نصف صدی بعد یہ حالت ہوئی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ان کے دو گورنروں نے لکھا (اور ان کے وہ خطوط اب شائع ہوگئے ہیں) کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں، زائد اموال کا کیا کریں؟ یہ ہے اسلام کی ہدایت اور اس کی معاشی تعلیمات پر عمل کا نتیجہ۔

آیئے اب اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرکے دیکھیں کہ ان میں کون سے اصول وقواعد ایسے ہیں جن پر چلنے سے معاشی خوش حالی حاصل ہوجاتی ہے۔ قرآن وسنت کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقصد سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو بعض کام کرنے سے روکا ہے اور بعض کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہم چند اہم نواحی و اوامر آپ کے سامنے رکھیں گے:

نواہی

ا۔ سود اور سودی قرض کی ممانعت

ربا یا سود کی عام فہم تفہیم مختصراً یہ ہے کہ پیسے کے ذریعے پیسے کمانا بغیر کسی محنت کے، جیسے ایک شخص نے دوسرے کو ایک لاکھ روپے قرض دیے اس شرط پر کہ چھ ماہ بعد جب وہ قرض واپس کرے گا تو اسے ڈیڑھ لاکھ روپیہ لوٹائے گا۔ اس ربا یا سود کا وسیع پیمانے پر استعمال ظالمانہ معاشی استحصال کا ذریعہ بنتا ہے۔ غریب پس جاتے ہیں۔ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے ربا سے منع کرتے ہوئے اسے اللہ ورسول ﷺ کے خلاف جنگ قرار دیا ہے:

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَـكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ۝﴾ [البقرہ ۲:۲۷۹]

''اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے

خلاف اعلان جنگ ہے اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کے تم حقدار ہو۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی شدید مذمت کی ہے اور اس کے خلاف مسلمانوں میں کراہت پیدا کرنے کے لیے اسے اپنی ماں سے زنا کے مصداق قرار دیا ہے۔[1] مسلمانوں کے بارہ سو سالہ دورِ حکومت میں ربا کبھی مسلم معیشت کا حصہ نہیں رہا۔

اس کے برعکس اسلام نے مسلمانوں میں قرضِ حسن کو رواج دیا۔ قرضِ حسن سے مراد ہے وہ قرض جس میں سود نہ ہو بلکہ اس میں بوقت ضرورت مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنے کا نیک جذبہ ہو، خواہ قرض ذاتی ضرورت کے لیے لیا جائے یا کاروبار کے لیے۔ قرضِ حسن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مقروض اگر اپنی مالی بدحالی پر قابو نہ پا سکے تو شریعت نے اس کے ساتھ نرمی کرنے اور اسے مزید مہلت دینے کا حکم دیا[2]۔ نیز اگر قرض سودی تھا تو سود وصول نہ کرنے کا اور صرف اصل زر وصول کرنے کا حکم دیا۔[3]

عصری اطلاق

اس اسلامی اصول پر اگر عصر حاضر کے ہمارے معاشی مسائل کے حوالے سے غور کریں تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

* سودی قرض نہیں لینا چاہیے، نہ انفرادی زندگی میں اور نہ ملکی سطح پر۔ یاد رہے کہ مغرب کے موجودہ سرمایہ دارانہ سودی نظام کی بنیاد ہی سودی قرض پر ہے۔ افراد اور تاجر بھی سودی قرض لیتے ہیں اور ریاستیں بھی۔ امریکہ جو اس وقت دنیا کا امیر ترین ملک ہے، دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے۔

* پاکستان کو سودی قرضے نہیں لینے چاہئیں نہ بیرون ملک سے اور نہ اندرون ملک سے، بلکہ معاشی خود مختاری کا منہج اپنانا چاہیے اور اپنے وسائل میں زندہ رہنا سیکھنا چاہیے۔ یہ

---

[1] مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۲۰۰۷

[2] البقرہ ۲: ۲۸۰

[3] البقرہ ۲: ۲۷۹

ممکن ہے بشرطیکہ اس کا عزم کرلیا جائے۔

* سودی ادارے یعنی سودی بنکنگ اور سٹاک ایکسچینج وغیرہ بند کردینے چاہئیں۔

* پاکستان کے لوگ چونکہ اس وقت معاشی بدحالی سے اور مہنگائی سے بھوکے مر رہے ہیں اس لیے حکومت پاکستان کو سودی قرضے واپس کرنے سے معذرت کرلینی چاہیے اور پانچ یا دس سال کی مہلت لے لینی چاہیے اور اس کے بعد بھی صرف اصل زر واپس کرنا چاہیے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں Planned Default کہتے ہیں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں اور یہ ممکن العمل ہے۔ پاکستان کے قرض خواہ چونکہ زیادہ تر اس وقت مغربی مما لک ہیں جو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے علمبردار ہیں اور مذہباً یہودی وعیسائی ہیں اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ قرآن انہیں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کہتا ہے[1] اور ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ماضی میں انہوں نے ہمارے علاقوں پر قبضہ کرکے ہمیں لوٹا، کنگال کیا اور کچلا وتباہ کیا اور آج ہمارے دیکھتے اس نے عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کیا ہے، شام اور یمن کچلے جا رہے ہیں، پاکستان، ترکی، سعودی عرب اور ایران وغیرہ شدید دباؤ میں ہیں۔ فلسطین، کشمیر وغیرہ سسک رہے ہیں۔ اہل مغرب نے منصوبہ بندی اور سازش سے پاکستان اور مسلم مما لک کو سودی قرضوں کے جال میں جکڑا ہے تاکہ انہیں حقیقی آزادی سے محروم کردے اور اسلامی شریعت پر عمل نہ کرنے دے۔ انہوں نے ہمارے غیر صالح، بے کردار، لالچی اور برائے نام مسلم حکمرانوں کو اپنا گماشتہ بنا کر انہیں کرپشن اور مالی بدعنوانی کی راہ دکھائی جنہوں نے سودی قرض لے کر عوام پر لگانے کی بجائے اپنی جیبیں بھریں اور پیسے بیرون ملک اپنے ذاتی حسابات میں جمع کرائے اور وہاں جائدادیں بنائیں اور کمپنیاں کھولیں۔ یہ کرپٹ حکمران جو مغرب کے غلام ہیں اور مغربی فکر وتہذیب کے دلدادہ ہیں، وہ اتنی جرات، ہمت اور حمیت نہیں رکھتے کہ مغربی ملکوں کی مرضی کے بغیر پلانڈ ڈیفالٹ کریں لیکن اس کے سوا پاکستان کے غریب مسلم عوام کو معاشی بدحالی کے چنگل سے نکالنے کا اور کوئی حل نہیں۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پاکستان میں کوئی ایسا دلیر حکمران آئے جو ہماری اس بات کو سمجھے اور اس پر عمل کرے۔

---

[1] المائدہ ۵:۵۱

۲۔کرپٹ مالی پریکٹسز

i۔ مال حرام کی ممانعت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے جسم کو حرام مال کھلائے اس پر جنت حرام ہے۔

وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وكُلُّ لحمٍ نبَتَ منَ السُّحتِ كَانَتِ النَّارُ أَوْلَى بِهِ۔ (۱)

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حرام سے پرورش پانے والا جسم، جنت میں داخل نہیں ہوگا، اور حرام سے پرورش پانے والا ہر جسم جہنم کی آگ ہی کا زیادہ حق دار ہے۔''

ii۔ باطل طریقے سے مال کھانے والے جہنم کا ایندھن بنیں گے:

﴿ إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴾[النساء۴:۱۰]

''وہ اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے بھرتے ہیں اور وہ عنقریب دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے۔''

باطل طریقے سے مال کمانے میں فراڈ، دھوکہ دہی اور کرپشن کی ساری صورتیں شامل ہیں۔خصوصاً اللہ تعالیٰ نے چوری اور ڈاکے کے شدید مذمت کی اور ان کے لیے ہولناک سزائیں مقرر کیں یعنی چوری میں قطع ید کی (۲) اور ڈاکے میں ہاتھ پاؤں کاٹنے کی (۳) تاکہ ملکیت کے تحفظ کا تقدس قائم ہوجائے۔

iii۔ رشوت نہ دو

﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾[البقرہ۲:۱۸۸]

---

(۱) مسند احمد، رقم الحدیث:۲۷۷۲

(۲) المائدہ۵:۳۸

(۳) المائدہ۵:۳۳

''اور یاد رکھو، ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ، رشوت کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ اور اس طرح جان بوجھ کر دوسروں کا مال ہڑپ نہ کرو۔''

iv۔ جوئے کی ممانعت

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾[المائدہ۵:۹۰]

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال گیری، سب گندے کام ہیں شیطان کے، لہٰذا ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

v۔ ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:

"لا يحتكر إلا خاطئ۔"[1]

''گناہ گار بندہ ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔''

ذخیرہ اندوزی یہ ہے کہ اجناس اپنے پاس جمع کر لی جائیں تاکہ جب مارکیٹ میں ان کی کمی ہو تو انہیں زیادہ قیمت پر بیچا جائے اور زیادہ منافع کمایا جائے۔

۳۔ کثرتِ مال اور حرص و لالچ کی مذمت

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾[۱۰۲: ۱، ۲]

''لوگو تمہیں بہت زیادہ حرص نے غافل کر دیا۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچتے ہو۔''

﴿وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝﴾[الفجر۸۹:۲۰]

''اور تم مال سے انتہائی محبت رکھتے ہو۔''

یہاں اس کثرت مال کی مذمت مقصود ہے جو دینی ذمہ داریوں اور آخرت سے غافل کر دے اور انسان میں نہ ختم ہونے والی حرص اور طمع پیدا کر دے جیسے آج کل راتوں رات امیر ہونے کی خواہش یا حرام اور مشکوک مال کمانا یا اعلیٰ معیارِ زندگی حاصل کرنے کے لیے دن

---

[1] جامع ترمذی، رقم الحدیث:۱۲۶۷

رات لگے رہنا وغیرہ۔

۴۔ارتکاز دولت کی ممانعت

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ [الحشر۵۹:۷]

''یاد رکھو، جو مال اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسری بستیوں والوں سے بطور فئے دلا دے تو اس میں حق ہے اللہ کا، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مومن رشتہ داروں کا، یتیموں کا، مسکینوں کا، اور مسافروں کا تا کہ وہ مال صرف تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔''

۵۔غلط طریقے سے خرچ کرنے کی ممانعت

- اسراف اور فضول خرچی کی مذمت

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾[الاعراف۷:۳۱]

''کھاؤ اور پیو مگر حد سے نہ بڑھو کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

پاکستان میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ بہت امیر ہیں اور کچھ بہت غریب۔غریبوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا اور امیروں کے کتے بھی اے سی میں رہتے ہیں اور روزانہ گوشت کھاتے ہیں۔بیوروکریسی، فوجی افسروں، اسمبلیوں کے ارکان وغیرہ کی تنخواہیں اور مراعات آسمانوں کو چھو رہی ہیں۔قیمتی زرمبادلہ سے اشیائے تعیش امیروں کے لیے درآمد کی جاتی ہیں وغیرہ۔

- بخل کی ممانعت

﴿الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴾[النساء۴:۳۷]

''جو لوگ خود بخل کریں اور دوسروں کو بخل سکھائیں اور اللہ نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہے اسے خرچ کرنے کی بجائے چھپائیں۔ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

بخل یہ ہے کہ جہاں شریعت نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں بھی خرچ نہ کیا جائے۔ بعض لوگوں کے پاس مال ہوتا ہے لیکن وہ تنگ دستی کی زندگی گزارتے ہیں یا اہل وعیال کو مالی تنگی میں مبتلا رکھتے ہیں۔یہ بھی غلط ہے۔

اوامر

i۔ امیروں کے مال میں غریبوں کا حق

﴿وَفِيٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ۝﴾[الذاریات۱۹:۵۱]

''اور ان کے مال میں سائل اور محتاج کا حصہ ہوتا تھا۔''

ii۔ زکوٰۃ وعشر

امیروں کے مال میں غریبوں کا جو حق ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو فرض ہے یعنی زکوٰۃ وعشر اور دوسرے صدقات نافلہ جنہیں ہم اردو میں عطیات وصدقات کہتے ہیں۔

زکوٰۃ جو فرض ہے اس کی یہ اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا قرآن کریم یں صلاۃ کے ساتھ سیکڑوں بار ذکر کیا ہے۔اس کی چار انواع ہیں۔

۱۔ کیش پر جو 2.5 فیصد سالانہ ہے۔

۲۔ نباتات واجناس پر جو نہری زمینوں میں 5 فیصد اور بارانی زمینوں پر 10 فیصد ہے۔دس فیصد کی رعایت سے اسے عشر بھی کہتے ہیں یعنی دسواں حصہ۔

۳۔ پالتو مویشیوں پر جیسے گائے بکری اونٹ وغیرہ

۴۔ زکوٰۃ الفطر جسے اردو میں فطرانہ کہا جاتا ہے اور رمضان کے آخر میں عید الفطر سے پہلے ادا کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ فقراء ومساکین بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں۔

اگر زکوٰۃ وعشر کا نظام صحیح معنوں میں فعال ہو اور حکومت اسے مؤثر بنائے تو اس سے معاشرے کی کایا پلٹی جا سکتی ہے اور غربت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں سامنے آچکا ہے جب انہیں دو گورنروں نے خط لکھے کہ ہمارے ہاں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں، ہم مال زکوٰۃ کا کیا کریں؟ یہ حالت دوبارہ واپس آسکتی ہے۔

ii۔ صدقات نافلہ (عطیات وصدقات وخیرات)

قرآن وسنت نے اس کی سخت تاکید کی ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ [الماعون ۱۰۷:۳]

''اور محتاج کے کھانے کی تاکید نہیں کرتا۔''

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ مومن نہیں جس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ پیٹ بھر کر کھائے۔[۱] اسی لیے مسلم صوفیاء نے معاشرے میں خدمت خلق کا وسیع نیٹ ورک قائم کیا۔

تقسیم دولت

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارتکاز دولت کے خاتمے کا حکم دیا ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ [الحشر ۵۹:۷]

''یاد رکھو، جو مال اللہ اپنے رسول ﷺ کو دوسری بستیوں والوں سے بطور فئے دلا دے تو اس میں حق ہے اللہ کا، اُس کے رسول ﷺ کا، رسول ﷺ کے مومن رشتہ داروں کا، یتیموں کا، مسکینوں کا، اور مسافروں کا تاکہ وہ مال صرف تمہارے مالداروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔''

تقسیم دولت کو یقینی بنانے کے لیے قرآن حکیم نے سود کی ممانعت کی، مسلمانوں کو ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری سے منع کیا۔ ان پر زکوٰۃ فرض کی اور صدقات نافلہ میں ان کو

---

[۱] معجم کبیر، رقم الحدیث: ۱۲۷۴۱

غریبوں کی مالی مدد کا حکم دیا۔ امام ابن حزمؒ اور بعض دوسرے بڑے اہل علم مسلم حکومت کو یہ اختیار بھی دیتے ہیں کہ اگر غربت کا خاتمہ نہ ہو تو حکومت ایمرجنسی میں امیروں سے زبردستی اموال فاضلہ لے کر غریبوں پر خرچ کر سکتی ہے۔ تقسیم دولت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور بڑا قدم اٹھایا اور وہ وراثت کے قوانین ہیں کہ ایک آدمی جب فوت ہو جائے تو اس کا سارا ترکہ، خواہ وہ جتنا بھی ہو، اس کے قریبی عزیزوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

معاشی امور میں میانہ روی (الاقتصاد) کا حکم

معاش میں میانہ روی کے کئی پہلو ہیں۔ سرمایہ اور محنت میں توازن، پرائیویٹ ملکیت اور نیشنلائیزیشن میں توازن۔ آمد و خرچ میں توازن۔ سادگی اختیار کرنا وغیرہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاشی امور میں میانہ روی میں اعتدال کا حکم دیا ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ [1]

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو میانہ روی اختیار کرتا ہے کبھی غریب نہیں ہوتا۔''

اسلام میں معاشی میانہ روی کی ایک مثال مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ قول ہے کہ اپنا خرچ اپنی آمدن سے ہمیشہ کم رکھو۔ اس سے تمہیں کبھی معاشی بدحالی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا بلکہ بچت کی وجہ سے امیر ہوتے جاؤ گے۔

زہد، توکل اور قناعت کا حکم

قرآن وسنت نے زہد، توکل اور قناعت کا حکم دیا ہے۔ زہد کا مطلب یہ ہے کہ کثرت دولت کی خواہش نہ کی جائے اور رزق کفاف پر خوش اور مطمئن رہا جائے۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان رزقِ حلال کے لیے محنت کرے لیکن نتائج کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کرے اور قناعت یہ ہے کہ آدمی کی محنت کے باوجود اللہ نے جو دیا ہے اس پر آدمی خوش اور مطمئن رہے۔

﴿وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝﴾ [الطلاق ۶۵:۳]

---

[1] مسند احمد، رقم الحدیث: ۴۲۶۹

''اسے (اللہ) وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اُسے گمان بھی نہ ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اس نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

"ازهد في الدنيا يحبك الله، وازهد فيما عند الناس يحبك الناس۔"[۱]

''دنیا سے بے رغبتی رکھو، اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جاؤ، تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔''

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافًا، وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا آتَاهُ۔"[۲]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ وہ کامیاب ہو گیا جو اسلام لایا، اسے حسبِ ضرورت رزق عطا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو کچھ دیا اس پر قناعت عطا فرمائی۔''

یاد رہے کہ زہد، توکل اور قناعت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی رزق حلال کے لیے محنت نہ کرے۔ محنت و کوشش تو ضروری ہے لیکن محنت و کوشش کے نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، بندے کے ہاتھ میں نہیں لہٰذا مال کی محبت میں باؤلا نہیں ہونا چاہیے کہ کثرت مال کی خواہش میں آدمی حرام کھانے پر اتر آئے اور باطل طریقوں سے مال کمانے لگے۔

تلخیص مباحث

۱۔ سود کو لین دین اور قرض کے ہر معاملے سے نکال دیا جائے خواہ وہ مقامی ہو یا بین الاقوامی۔

۲۔ حکومت ہر طرح کے قرضے لینے سے اجتناب کرے، خواہ مقامی ہوں یا بین الاقوامی، اور خود انحصاری کی پالیسی اپنائے۔

۳۔ حکومت پاکستان ماضی میں بین الاقوامی سودی قرضے لیتی رہی ہے جن کی واپسی

---

[۱] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۴۱۰۲

[۲] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۰۵۴

اس کے لیے مشکل بن چکی ہے اوران قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لیے وہ مزید سودی قرضے بین الاقوامی اداروں اور دوسرے ممالک سے لے رہی ہے۔حکومت کو چاہیے کہ اس روش سے فوراً باز آجائے اور عامۃ الناس پر ظالمانہ ٹیکس لگا کر انہیں مہنگائی کی چکی میں پیس کر ان کو دو وقت کی عزت کی روٹی سے محروم نہ کرے بلکہ قرض خواہوں سے درخواست کر کے اگلے دس سال کے لیے اقساط کی ادائیگی سے معذرت کرے اور دس سال بعد اصل زر کی ادائیگی حسب مقدرت آسان اقساط میں واپس کرنے کے مطالبے پر اصرار کرے اور منوائے۔اور اگر نہ مانیں تو بھی جرأت وحمیت سے کام لے کر باصرار اس پر عمل کرے تاکہ عامۃ الناس مہنگائی کے عفریت سے بچ سکیں،سکھ کا سانس لے سکیں اور غربت سے نکل کر عزت کی زندگی بسر کرسکیں۔اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو اتنی نعمتوں اور اتنے وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے کہ وہ بیرونی مدد کے بغیر داخلی انحصار کی پالیسی سے بآسانی گزر بسر کرسکتا ہے بشرطیکہ حکمران اس کی ہمت اور پلاننگ کریں۔

۴۔ زکوٰۃ وعشر اور صدقات کے نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق مؤثر طریقے سے نافذ کرے۔

۵۔ حکومت ٹیکس صرف امیر طبقے پر لگائے اور ان سے لے کر غریب طبقات پر خرچ کرے۔غربت اور مہنگائی کا خاتمہ ہر حکومت کی بنیادی ترجیح ہونا چاہیے۔

۶۔ حکومتی عناصر خصوصاً اشرافیہ (مقننہ، انتظامیہ، بیورکریسی، عدلیہ، فوج وغیرہ) کو جو ہوش ربا سہولتیں اور آسائشیں دی جارہی ہیں وہ ختم کردی جائیں اور ان کا بہاؤ غریب عوام کی طرف کردیا جائے۔

۷۔ سامان تعیش کی درآمدات فوراً اور دیگر درآمدات بتدریج بند کردی جائیں جو چیزیں درآمد کی جارہی ہیں وہ مقامی طور پر بنائی جائیں۔

۸۔ چھوٹی اور مقامی صنعتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ عامۃ الناس کو روزگار مہیا آسکے۔ نیز غریبوں کو بلاسود قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ گھریلو صنعتوں کو فروغ دے کر رزق حلال کماسکیں۔

۹۔ عامۃ الناس خصوصاً تاجروں اور حکومتی وپرائیویٹ ملازمین کی اخلاقی تربیت کی

جائے اور سخت قوانین بنائے جائیں تاکہ وہ پرکرپشن یعنی فراڈ، رشوت، چوری، ڈاکے، دھوکہ دہی، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ اور حرام و باطل طریقوں سے مال کمانے سے بچیں۔

۱۰۔ اخراجات کے غیر اسلامی پہلوؤں سے بچنے کے لیے ترغیب وترہیب سے کام لیا جائے اور اسراف اور دادودہش پر مبنی اعمال رسوم کا خاتمہ کیا جائے۔

۱۱۔ جن پاکستانیوں نے اپنی ناجائز آمدنی غیر قانونی طور پر بیرون ملک بھجوائی ہے یا وہ اندرون ملک موجود ہے، اسے بحق سرکار ضبط کرلیا جائے اور عوامی بہبود پر خرچ کیا جائے۔

۱۲۔ ان معاشی ماہرین کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے جو اسلامی تناظر میں سوچتے ہیں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے سابقہ اور موجودہ ملازمین اور مغربی معیشت کی نقالی کرنے والے ماہرین سے معذرت کرلی جائے۔ نیز سٹیٹ بینک اور ملکی معیشت کو بین الاقوامی مالیاتی سودی اداروں کے چنگل سے نکالا جائے۔

۱۳۔ یونیورسٹیوں میں معاشیات و مالیات کی تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا جائے اور بڑے شہروں کے دینی مدارس میں اسلامی معاشیات کے تخصص کا اجراء کیا جائے تاکہ مستقبل میں اسلامی معیشت کے ماہرین تیار ہوسکیں۔

۱۴۔ سرمایہ دارانہ معاشی اداروں بینکوں، سٹاک ایکسچینج وغیرہ کو حیلوں سے اور برائے نام کاغذی تبدیلیوں سے ''اسلامی'' بنانے کی بجائے ان کے اسلامی متبادل ادارے قائم کرنے کے لیے اجتہادی سپرٹ سے کام لیا جائے اور اسلامی تناظر میں نئے معاشی اور مالیاتی ادارے قائم کیے جائیں۔

۱۵۔ بحیثیت مجموعی مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو ترک کرکے اسلام کے معاشی نظام کے احیاء کے لیے کام کیا جائے۔ اس کے لیے نئے تدریسی و تحقیقی ادارے بنائے جائیں اور ان کے تحقیقات وسفارشات پر عمل کیا جائے۔

یادرہے کہ ہم نے یہ تجاویز ملی مجلس شرعی کے اجلاس میں پیش کی تھیں اور سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام نے ان کی حمایت کی تھی۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب الغلمین۔

فقہ و قانون

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

سپریم کورٹ کا ایک اور غیر شرعی فیصلہ

جسٹس منصور علی شاہ نے ARY کے فحش ڈرامے کو دکھائے جانے کی اجازت دے دی

۱۲/اپریل ۲۰۲۳ء کو سپریم کورٹ کے جج جسٹس منصور علی شاہ (اور جسٹس عائشہ ملک) کا ایک فیصلہ سامنے آیا ہے جس کی بنیاد اسلام کی بجائے سیکولرزم، لبرل ازم اور ان کی اقدار پر ہے۔ واقعہ مختصراً یہ ہے کہ ۲۰۲۰ء میں ARY ٹی وی ایک ڈرامہ سیریل 'جلن' کے نام سے دکھا رہا تھا جس میں سالی اور دلہا بھائی کا معاشقہ گلیمرائز کر کے چٹخارے دار طریقے سے دکھایا جا رہا تھا۔ لوگوں نے اس واہیات ڈرامے کی پیمرا (PEMRA) سے شکایت کی تو پیمرا نے پہلے ARY کو شوکاز نوٹس دیا اور پھر اس ڈرامے پر پابندی لگا دی۔ ARY نے اس کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں اپیل کی اور مقدمہ جیت لیا۔ اس پر پیمرا نے سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ عدالت عظمیٰ کے دو رکنی بنچ نے نومبر ۲۰۲۲ء میں کیس سن کر فیصلہ محفوظ کر لیا جو ۱۲/اپریل ۲۰۲۳ء کو سنایا گیا اور پیمرا کی درخواست رد کرتے ہوئے مذکورہ ڈرامے کو دکھائے جانے کی اجازت دے دی۔

اس کیس میں دو قانونی نکتے تھے ایک یہ کہ پیمرا نے جو ایک سرکاری ادارہ ہے، خود پابندی لگانے کا فیصلہ کر لیا اور اس ادارے سے مشورہ نہیں کیا جو عوام کی نمائندگی کے لیے قانون نے 'کونسلز آف کمپلینٹس' (Councils of Complaints) کے نام سے بنایا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ پیمرا نے ARY کو اپنے شوکاز میں ڈرامے کو غیر اسلامی، خلاف قرآن اور نوجوانوں کے اخلاق کے لیے تباہ کن قرار دیا تھا، ARY نے اس کی تردید کی لیکن سپریم کورٹ نے اس نکتے کو چھیڑا ہی نہیں اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی مغرب کی جمہوری اقدار کے تناظر میں تشریح کر کے ARY کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

پہلے نکتے سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں تاہم دوسرے نکتے کو ہم زیر بحث لائیں گے لیکن اس سے پہلے حالات کا پس منظر واضح کرنے کے لیے دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ایک یہ کہ اس وقت دنیا میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً اسلام اور مغربی فکر وتہذیب میں ایک کشمکش برپا ہے۔ یورپی ممالک نے اسلام اور مسلم دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو غلام بنالیا اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ انہیں لوٹا، کچلا، تباہ کیا اور ان کی ریاستوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا۔ پھر ان کے اجتماعی ڈھانچے کو گرا کر اپنی فکر وتہذیب کے مطابق نیا اجتماعی ڈھانچہ قائم کیا اور مسلمانوں کو فکری اور عملی غلام بنائے رکھنے کے لیے شخصیت سازی کے سارے ذرائع استعمال کیے جیسے میڈیا، تعلیم وتربیت، ادب وثقافت وغیرہ۔ پھر جب دوسری جنگ عظیم کے بعد انہیں مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی تو استعمار نے امن کا چولہ پہن لیا اور مسلم معاشرے کے حکمران طبقوں کو ساتھ ملا کر فکری وعملی غلامی کے تسلسل کو جاری رکھا اور جب اس کی سازشوں اور کوششوں کے علی الرغم کچھ مسلم ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہوگئے تو انہیں اپنی اسلحی برتری سے تباہ کردیا۔ ہماری آنکھوں دیکھتے اہل مغرب نے عراق، افغانستان، شام اور یمن کو تباہ کردیا، فلسطین اور کشمیر میں مسلمان سسک رہے ہیں اور پاکستان، سعودی عرب، ترکی اور ایران پر شدید دباؤ جاری ہے۔ نوے کی دہائی میں سوویت روس کے ٹوٹنے کے بعد یورپ وامریکہ اسلام اور مسلمانوں کو واحد مدّمقابل سمجھ کر ان کی بیخ کنی پر تل گئے ہیں اور مسلم معاشرے خصوصاً پاکستان میں ایک فکری، نظریاتی اور تہذیبی جنگ جاری ہے۔ دینی عناصر پاکستان کو اسلامی معاشرہ اور اسلامی ملک بنانا چاہتے ہیں جب کہ مغرب کی ہم نوا قوتیں ملک کو سیکولر اور لبرل بنانا چاہتی ہیں۔

دوسری یہ کہ پاکستان میں میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل)، نظام تعلیم وتربیت، ادب وثقافت اور تعمیر شخصیت کے سارے ذرائع مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کے زیر اثر ہیں۔ ساتھ دینی عناصر بھی ملک میں کام کررہے ہیں جو پاکستان کو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

یوں پاکستان کا سیاسی اور دستوری نظام اسلام اور مغرب کے غیر اسلامی سیاسی اصولوں کا ایک ناقابل فہم ملغوبہ بن کر رہ گیا ہے۔ مغرب کی ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم اور نظام سرمایہ داری کی پیداوار غیر اسلامی ''جمہوریت'' میں کچھ اسلامی اصول داخل کرکے اسے ''اسلامی جمہوریت'' کہنا شروع کردیا گیا ہے۔ اس طرح پاکستان مغربی طرز کا ''جمہوری'' ملک بننے کی

بجائے'اسلامی جمہوریہ پاکستان'بن گیا۔اس کا آئین قرآن وسنت ہونا چاہیے تھا اور اگر مغربی طرز کا آئین بنانا ہی تھا تو اس کی پہلی دفعہ/شق میں پوری صراحت کے ساتھ لکھ دیا جانا چاہیے تھا کہ اصلاً مسلمانوں کا دستور تو قرآن وسنت ہیں لہٰذا ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے سارے ادارے (عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ وغیرہ) اور آئین وقوانین قرآن وسنت کے تابع ہوں گے لیکن ایسا نہ ہوا اور آئین کو اسلامی اور غیر اسلامی دفعات کا ملغوبہ بنا دیا گیا اور قرآن وسنت کو اس میں بالادستی نہ مل سکی۔

اکثر اسلامی اصولوں کو Principles of Policy میں درج کر دیا گیا یا دستور کے دیباچے میں لکھ دیا گیا اور جب ضیاء الحق نے قرارداد مقاصد کو 2A بنا کر اسے دستور میں قابل نفاذ بنا دیا تو سپریم کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ اسے باقی دستور پر غلبہ حاصل نہیں ہوگا[1]۔ یوں دستور وقوانین کو قرآن وسنت کے تابع رکھنے کا راستہ بند ہو گیا۔ ورنہ اگر دستور قرآن وسنت کے تابع ہوتا تو جسٹس منصور علی شاہ صاحب کا یہ فیصلہ بھی یوں نہ آتا کیونکہ جو بنیادی حقوق مغرب نے طے کر رکھے ہیں اور اقوام متحدہ کو اپنی لونڈی بنا کر اس کے ذریعے ساری دنیا پر اور مسلمانوں پر مسلط کر رکھے ہیں اور پاکستان کے دستور کے شروع میں بھی انہیں درج کر کے انہیں دستور کا اہم بنیادی جزو بنا دیا گیا ہے ان کی بہت سی شقیں غیر اسلامی ہیں اور قابل رد ہیں جن میں ''حق آزادئ اظہار رائے'' بھی شامل ہے جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

مذکورہ بالا حالات کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے وکلاء اور ججز کو نہ تو قرآن وسنت اور اسلامی قانون (قرآن وسنت اور فقہ اصول فقہ) کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ اس کے تقاضوں کے مطابق ان کی تربیت ہو پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ عدلیہ کے ججز (جن کی تربیت کامن لاء کے تحت ہوئی ہوتی ہے) آئین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں نہ کہ شریعت کے مطابق اور آئین کے مطابق فیصلے کرتے ہوئے بھی وہ اسلامی دفعات کو سامنے نہیں رکھتے۔ چنانچہ یہ مضحکہ خیز واقعہ ہم سب کے سامنے چند سال پہلے پیش آیا کہ شاتم رسول کو قتل کرنے

---

[1] Zaheeruddin Vs State PLD: 1993SCMR1715

والے ممتاز قادریؒ کو ابتدائی عدالت کے جج صاحب نے یہ کہہ کر سزائے موت دی کہ اس نے شرعاً تو کوئی گناہ نہیں کیا لیکن میں پاکستان کے انسدادِ دہشت گردی کے قوانین کے تحت اسے سزائے موت دیتا ہوں اور جب اس کی اپیل عدالت عظمیٰ میں پہنچی تو ممتاز قادریؒ کے وکیل نے آیات واحادیث پڑھنی شروع کیں تو ججوں نے کہا کہ ہم شریعہ جج نہیں ہیں، ہم نے تو فیصلہ آئین کے مطابق کرنا ہے اور اپیل خارج کر دی۔

یہ سارا پس منظر ذہن میں رکھیے اور آیئے اب جسٹس منصور علی شاہ صاحب کے فیصلے کی طرف جس کے ٹائٹل میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس فیصلے کی تحقیق میں میڈم فریحہ عزیز نے ان کی مدد کی ہے۔ یاد رہے کہ پاکستانی نژاد فریحہ عزیز ٹورنٹو (کینیڈا) میں ایک لاء فرم چلاتی ہیں، بیرسٹر ہیں، قانون انہوں نے وہیں پڑھا ہے اور وہیں پریکٹس کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے وہ مغربی قانون کی ماہر ہیں (اسلامی قانون نہ ان کی ڈومین ہے، نہ تخصص اور نہ دلچسپی کا موضوع)۔ وہ ایک پاکستانی NGO ''بول بھی'' کے بانیوں میں سے ہیں جو آزادیٔ اظہار رائے (مغربی تناظر میں) کے لیے کام کرتی ہے۔

۲۔ جسٹس صاحب نے اپنے فیصلے کے پہلے پیراگراف ہی میں واضح کر دیا ہے کہ جو چیز وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ پیمرا آرڈیننس کی دفعہ 27(A) میں جو

'Obscene', 'Vulgar' and 'Offensive to the Commonly accepted standards of Decency'

کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں (یعنی نشر ہونے والے مواد کو ''فحش''، ''بیہودہ'' اور ''شائستگی کے عمومی مسلمہ معیارات کے خلاف'' نہیں ہونا چاہیے) ان کی تشریح ہونی چاہیے۔

In the context of our constitutional values and fundamental rights, in particular, the right to freedom of speech and expression and right to information guaranteed by articles 19 & 19A of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan.

(ہماری دستوری اقدار اور بنیادی حقوق کے تناظر میں خصوصاً آزادی اظہار رائے اور

حصول معلومات کے حقوق کے ضمن میں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں دیے گئے ہیں)۔

یہاں ہماری گزارش یہ ہے کہ

i۔ اولاً تو پیمرا کا قانون ہی ناقص ہے۔ قانون بنانے والوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ قابل نشر مواد کے ''فحش''، ''بیہودہ'' اور ''شائستگی کے عمومی مسلمہ معیارات کے خلاف'' ہونے کے مفاہیم کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ ان الفاظ کا وہ مفہوم لیا جائے گا جو اسلام میں ہے، جو قرآن وسنت میں ہے جیسا کہ قرارداد مقاصد (اب آئین کا آرٹیکل 2A) میں ہے کہ پاکستان میں جمہوریت، عدل، رواداری کے اسلامی مفاہیم پر عمل کیا جائے گا۔ اگر یہ لکھ دیا جاتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔

ii۔ ہم کہتے ہیں کہ سپریم کورٹ (کے جج منصور علی شاہ صاحب) کو بھی اس اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا یعنی ان الفاظ کا وہی مفہوم لینا چاہیے تھا جو قرآن وسنت میں ہے کیونکہ یہ دستور کی اسلامی دفعات کا تقاضا ہے مثلاً دفعہ 2 میں کہا گیا ہے کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا۔ دفعہ 2A میں قرارداد مقاصد کو آئین کا قابل نفاذ حصہ بنا دیا گیا ہے۔ دفعہ 31 میں ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ مزید برآں دستور کہتا ہے کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق بنایا جائے گا۔ قرآن حکیم اور عربی کی تعلیم کو عام کیا جائے گا۔ جوا، شراب نوشی، قحبہ گری، فحاشی کے خلاف اقدامات کیے جائیں گے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت قائم کی جائے گی۔ زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ اب آیئے جسٹس صاحب کے اس بنیادی استدلال کی طرف کہ ARY کو یہ ڈرامہ آن ایئر کرنے کا حق حاصل ہے اس لیے کہ دستور کی بنیادی حقوق کی دفعہ 19، 19A پاکستانیوں کو حق آزادیٔ اظہار رائے اور حق حصول معلومات دیتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر جسٹس صاحب ان بنیادی حقوق کی تشریح قرآن وسنت کی روشنی میں کرتے تو ہرگز ARY

کو اس ڈرامے کو آن ایئر کرنے کی اجازت نہ دیتے کیونکہ قرآن حکیم حق آزادیٔ اظہار اور نشر مواد کو تین شرطوں سے مشروط کرتا ہے:

ایک: یہ کہ کسی لوازمے/مواد کو پھیلایا نہ جائے جب تک اس کے صحیح ہونے کی تحقیق، حکومتی ادارے اور اہل علم و دانش نہ کر لیں اور یہ کہ اس بات پر عمل نہ کرنا شیطانی فعل ہے:

﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [النساء ۴:۸۳]

''اور جب منافقوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو اسے یہ فوراً لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت جان لیتے اور اے مسلمانو! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب اپنی کمزوریوں کے باعث شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔''

دوسرے: فحش، بیہودہ اور خلاف شائستگی مواد پھیلانے والوں کو اللہ دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دے گا اور یہ کہ اس معاملے میں تمہارا علم ناقص ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کرو۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النور ۲۴:۱۹]

''بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے اور یاد رکھو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

تیسرے: یہ کہ قرآن حکیم ہماری یہ رہنمائی فرماتا ہے کہ اگر کسی کام میں اچھے اور برے دونوں پہلو ہوں تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں برائی کا پہلو غالب ہے یا نیکی کا۔ اگر برائی کا پہلو غالب ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے شراب اور جوئے کو حرام،

گندا اور شیطانی عمل قرار دیا کیونکہ ان میں گناہ اور مضرات بہت زیادہ ہیں اور نفع بہت کم (اگرچہ نفع بھی ہے، اس کا انکار نہیں کیا) اور اس پر عمل کو سبب فلاح قرار دیا۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾[البقرہ ۲:۲۱۹]

''لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔''

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے۔ ابھی بعض لوگوں کا مفاد ان سے وابستہ ہے۔ مگر ان دونوں کا گناہ ان سے وابستہ مفاد سے بڑھ کر ہے۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾[المائدہ ۵:۹۰]

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال گیری، سب گندے کام ہیں شیطان کے، لہٰذا ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

۴۔ اسی طرح اگر جسٹس صاحب حق حصول معلومات (Right to Information) کی تشریح اسلامی اصولوں کے مطابق کرتے تو کبھی ARY کا بیہودہ ڈرامہ دیکھنے کو مسلمان عوام کا بنیادی حق نہ قرار دیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم سے پناہ مانگی ہے جو نفع بخش نہ ہو۔ فرمایا:

"اللّٰھم إنی اعوذ بك من...... علم لا ینفع۔"[۱]

اور اللہ تعالیٰ نے ندی نالوں میں طغیانی کے وقت یا دھاتیں پگھلاتے وقت اوپر آنے والی جھاگ کو بے وقعت اور عارضی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ جو اصل نفع بخش عنصر ہے، اللہ

[۱] سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۵۴۰

اس کو باقی رکھتا ہے:

﴿اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ۞﴾ [الرعد ۱۳:۱۷]

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ندی نالے اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے اُبھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور دیکھو اسی طرح کا جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اُبھر آتا ہے جنہیں لوگ زیور یا نئی چیزیں بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ جھاگ باطل ہے اور وہ سُوکھ کر مٹ جاتا ہے مگر انسانوں کو نفع پہنچانے والی چیز حق ہے جو زمین میں باقی رہتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔''

* اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے آنکھوں اور کانوں، جو حصول معلومات اور حصول علم کا بنیادی ذریعہ ہیں، کے غلط استعمال کی شدید مذمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

- ہر آدمی اپنے کانوں، آنکھوں اور دل کے صحیح استعمال کے لیے جواب دہ ہے۔:

﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۤئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ۞﴾ [الاسراء ۱۷:۳۶]

''ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تمہیں خبر نہیں۔ بے شک کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

- لوگوں کے حق قبول نہ کرنے کی وجہ ان کا آنکھوں، کانوں اور زبان کا غلط استعمال ہے:

﴿صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ۞﴾ [البقرہ ۲:۱۸]

''وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، کبھی سیدھی راہ پر نہیں آئیں گے۔''

﴿وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ ﴾

[الاعراف ۷:۱۷۹]

''گویا ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھ نہیں پاتے اور ان کے کان تو ہیں لیکن وہ سن نہیں سکتے۔''

- اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو غض بصر کا حکم دیا ہے یعنی وہ غیر محرم کو عمداً نہیں دیکھ سکتے اور عورتوں کو اپنی زینت ظاہر کرنے سے روکا ہے اور انہیں پردے کا حکم دیا ہے۔

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ﴾[النور ۲۴:۳۰،۳۱]

''آپ ﷺ مومن مردوں سے کہیں وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے پاکیزہ طریقہ ہے۔ بے شک اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں۔ اور اے نبی ﷺ آپ مومن عورتوں سے کہیں وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے خود بخود ظاہر ہو جائے۔''

- آنکھوں کا ایسا استعمال جس سے زنا کی ترغیب ملے آنکھ کا زنا ہے اور کانوں کا ایسا استعمال جس سے زنا کی ترغیب ملے کانوں کا زنا ہے۔[1]

- جو لوگ گندے گانے سنتے ہیں ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا[2] اور گانا دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی سے کھیتی پروان چڑھتی ہے۔[3]

- حضرت علیؓ نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ گھر سے باہر یا بازار میں چلتے ہوئے غیر محرم پر نظر پڑ جاتی ہے، اس کا کیا حکم ہے۔ آپ ﷺ نے جواب دیا: پہلی نظر جو غیر ارادی

---

[1] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۲۴۳

[2] الجامع الصغیر للالبانی حدیث: ۴۵۱۰

[3] شعب الایمان، رقم الحدیث: ۵۱۰۰

طور پر پڑے وہ معاف ہے اور اگر دوسری بار ارادۃً دیکھا تو گناہ ہے۔[1]

* اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے لھو ولعب یعنی ایسی تفریح (Entertainment) اور کھیلوں (Games) سے روکا ہے جس سے آدمی اپنی دینی، اخلاقی اور تعمیری ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے (جیسے گانے سننا، ڈرامے اور فلمیں دیکھنا، ناول افسانے پڑھنا، شطرنج کھیلنا وغیرہ)۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَالۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ‌ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ﴾[لقمان ۳۱:۶]

"بعض لوگ ایسی باتوں کے خریدار بنتے ہیں جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں تاکہ وہ دوسرے کو بھی اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔ ان کے پاس علم بھی نہیں اور وہ دعوتِ حق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔"

- کفار نے آپ ﷺ کی دعوت کو غیر موثر کرنے کے لیے گانے بجانے والیوں کا سہارا لیا۔

نبی کریم ﷺ نے بھی لھو ولعب کی سخت مذمت کی ہے۔ شراب اور گانے سے منع کیا ہے[2]۔ شطرنج کھیلنے سے منع کیا ہے[3]۔ آلاتِ موسیقی اور بانسری بجانے سے منع کیا ہے۔[4]

* حق حصول معلومات کے تناظر میں یہ بھی دیکھیے کہ جس علم یا معلومات کا حصول ضروری ہے وہ کون سی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ۔"[5]

"یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

---

[1] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۲۱۴۹
[2] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۵۹۰
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۵۸۹۶
[4] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۴۹۲۴
[5] سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث: ۲۲۴

کون سا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے؟ سارے مسلم اہل علم مثلاً امام غزالیؒ کہتے ہیں [1] کہ جو علم حاصل کرنا ہر مسلمان فرض ہے یعنی فرض عین ہے وہ "الدین بالضرورۃ" ہے یعنی دین کی بنیادی معلومات کا علم جیسے توحید، رسالت، آخرت، عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ)۔ اخلاق (جیسے جھوٹ نہ بولنا، غیبت نہ کرنا وغیرہ) اور معاملات (جیسے والدین کی اطاعت کرنا، چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا وغیرہ)۔ دین کا تفصیلی علم حاصل کرنا یا دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جن علوم وفنون ومہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے (جیسے علم طب، انجینئرنگ وغیرہ) ان کا حصول فرض کفایہ ہے یعنی اتنے لوگوں کا حاصل کرنا ضروری ہے جس سے معاشرے کی ضرورت پوری ہو جائے، ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ بعض علوم کا حاصل کرنا مضر ہے (جیسے علم نجوم، رمل، جادو سیکھنا وغیرہ)۔

ہم بڑے ادب کے ساتھ جسٹس صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر حق آزادئ اظہار اور حق حصول معلومات کے جو دو بنیادی حقوق آئین پاکستان نے دیے ہیں، ان کی تشریح اگر وہ قرآن وسنت کی ان تعلیمات کی روشنی میں کریں جو ہم نے سطور بالا میں پیش کی ہیں تو میڈیا میں گانے، ناچنے، بیہودہ اور فحش ڈرامے اور فلمیں دکھانے کی کتنی آزادی پاکستان میں بسنے والی 97.3 فیصد مسلمان آبادی کے لیے انہیں نظر آتی ہے جو قرآن وسنت کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں اگر وہ

Obscene, Vulgar and offensive to the commonly accepted standards of decency

کی تشریح مغربی فکر وتہذیب کی روشنی میں کریں یا مغربی سوسائٹی کو سامنے رکھ کر کریں تو بلاشبہ ناچنا، گانا، فحش اور بیہودہ ڈرامے اور فلمیں دیکھنا آج کی ڈیموکریٹک سوسائٹی اور سٹیٹ کی ضرورت ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے جج ہیں یا کسی یورپی یا امریکی ملک کے؟ کیا جس آئین کے تحت انہوں نے فیصلہ کرنا ہے کیا وہ نہیں کہتا کہ اس ریاست کا مذہب اسلام ہے، اس میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، یہاں ریاست کی ذمہ

---

[1] امام غزالی، احیاء علوم الدین، باب دوم، دارالاشاعت، کراچی

داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں ان کی مدد کرے اور یہاں کوئی قانون خلاف اسلام نہیں بنایا جاسکتا اور یہاں قرآن حکیم اور عربی کی تعلیم عام کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہاں وہ کس طرح مغربی فکر وتہذیب کے سیکولر، لبرل، ہیومنسٹک، سرمایہ دارانہ نظریات کے تحت میڈیا میں فحاشی، بیہودگی اور اسلامی اقدار کے منافی رویوں کو فروغ دینے کی بات کر سکتے ہیں؟

۵۔ پھر ایک اور بات جسے جسٹس صاحب نے پیراگراف نمبر 7، 9، 24 اور 26 میں بار بار دہرایا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ''جمہوری'' ریاست میں اختلاف رائے، رواداری (Tolerance) اور تنوع (Pluralism) کو فروغ دیا جانا چاہیے خواہ یہ اختلاف عقیدے، رسم ورواج، مذہب، نسل اور جنسی رجحانات (Sexual Orientation) کا ہو اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ Tolerance کا یہ تصور کوئی جامد تصور نہیں بلکہ یہ سماجی تبدیلیوں اور سیاسی حالات وغیرہ کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔ جسٹس صاحب کے خیالات اس موضوع پر اہم ہیں اور ان کا مطالعہ مفید ہوگا:

- پیراگراف 7 میں فرماتے ہیں:

It is essential for the healthy functioning of a democratic society to encourage exchange of ideas, foster debate and allow for the development of diverse opinions and perspectives.

یعنی ایک 'جمہوری' معاشرے کی تعمیری ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اختلاف رائے، بحث مباحثہ اور تبادلۂ خیال کو فروغ دیا جائے۔

- پیراگراف 9 میں فرماتے ہیں:

"Reasonable Restrictions" flow from Articles 19 and 19A of the Constitution and the statutory restrictions by and under the PEMRA Ordinance are to be interpreted in a forward looking manner in order to persistently advance and promote the constitutional values of tolerance, freedom, equality,

democracy and social justice.

یعنی آئین اور پیمرا کے قانون میں جن 'معقول پابندیوں' کا ذکر ہے، ان کی تشریح اس طرح مثبت انداز میں کرنی چاہیے جس سے دستوری اقدار کو فروغ حاصل ہو جیسے رواداری (Tolerance)، آزادی (Freedom)مساوات (Equality)، جمہوریت (Democracy)اورعدل اجتماعی(Social Justice)[بیچارے اسلام، اسلامی اقدار یا نظریہ پاکستان کا کہیں ذکر نہیں]۔

- پیراگراف 24میں فرماتے ہیں:

We wish to underline that the members of the Councils of Complaints while applying the constitutional and statutory standards must always view the media content through the lens of the constitutional value of tolerance. “Tolerance” is an essential preambular constitutional value that assumes more significance in the context of freedom of expression and right to information. It is a multifaceted concept and at its core, tolerance refers to the ability or willingness to accept and respect differences in opinions, beliefs, customs and practices among individuals or groups. This can include differences in race, religion, culture, gender, sexual orientation, political ideology and other aspects of human diversity. Tolerance promotes understanding, harmony and coexistence among people with diverse backgrounds, fostering open-mindedness and empathy. In a broader sense, it is an essential aspect of democratic societies as it supports freedom of expression and the exchange of ideas, ultimately contributing to social cohesion and stability.

یعنی ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ جب کونسلز آف کمپلینٹس کے ارکان قابل نشر مواد کے دستوری وقانونی معیار پر غور کریں تو انہیں رواداری (Tolerance) کی دستوری قدر کی عینک سے چیزوں کو دیکھنا ہوگا۔ ٹالرینس وہ ابتدائی اور لازمی دستوری قدر ہے جس کا گہرا

تعلق حق اظہار رائے اور حق حصول معلومات سے ہے۔ٹالرنیس ایک کثیر جہتی تصور ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد اور مختلف طبقات فکر ونظر، عقیدے، رسم ورواج اور رویوں کے اختلافات کو نہ صرف برداشت کریں بلکہ اس کی تکریم کریں۔ اس میں نسل ، مذہب، جنس (عورت یا مرد ہونا) کلچر، سیاسی آراء اور جنسی رجحانات (Sexual Orienation) اور انسانوں کے مابین ہر طرح کا اختلاف اور تنوع شامل ہے۔ٹالرنیس سے مختلف پس منظر رکھنے والے افراد میں مفاہمت، یگانگت اور پر امن بقائے باہمی کو فروغ ملتا ہے اور وسعت نظری اور باہم ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں ۔ وسیع تر تناظر میں دیکھیے تو ٹالرنیس 'جمہوری' معاشرے کا لازمی جزو ہے کیونکہ اس سے آزادیٔ اظہار رائے اور تبادلۂ خیال کے عمل کو تقویت ملتی ہے جس سے سماجی یکجہتی اور معاشرتی استحکام میں اضافہ ہوتا ہے۔

جسٹس صاحب فرماتے ہیں کہ آپ دوسروں کے جن جنسی رجحانات کو غلط سمجھتے ہیں ، انہیں بھی برداشت کریں کہ ٹالرنیس کا یہی تقاضا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا شرم وحیا اور عفت اسلامی اقدار نہیں؟ اور کیا اسلام ان کو فروغ نہیں دینا چاہتا؟ یا آپ دونوں میں تقابل کر کے دیکھ لیجیے کہ آیا اسلام شرم وحیا اور عفت کا فروغ چاہتا ہے یا دوسروں کے غلط جنسی رجحانات کو برداشت کرنے کا؟

پراگراف 26 میں جسٹس صاحب مزید فرماتے ہیں:

The fundamental point that needs to be noted in this regard is that the exhibition of any kind of works of art and literature which include plays and dramas broadcasted on electronic media, is a part of the fundamental right to freedom of expression guaranteed by Article 19 of the Constitution and right to information guaranteed under Article 19A of the Constitution. Freedom of expression and right to information are complementary fundamental rights and constitute essential foundations of a democratic society. It is applicable not only to information or ideas that are favorably received but also to those which offend, shock or disturb the State or any other

sector of the population. Such are demands of pluralism, tolerance and broadmindedness without which there is no democratic society.

ترجمہ: یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہر قسم کے آرٹ اور لٹریچر کی اشاعت/ نمائش، بشمول الیکٹرانک میڈیا یا پرنشر ہونے والے کھیل اور ڈرامے، دستور کے آرٹیکل 19 کے تحت دیئے گئے حق آزادیٔ اظہار رائے اور آرٹیکل 19A کے تحت دیئے گئے حق حصول معلومات کا ایک حصہ ہیں۔حق آزادیٔ اظہار رائے اور حق حصول معلومات دستور کی رو سے بنیادی حقوق میں شامل ہیں اور ایک ''جمہوری'' سوسائٹی کی لازمی بنیاد ہیں۔اس کا اطلاق صرف ان معلومات اور خیالات پر ہی نہیں ہوتا جنھیں عوام میں قبول عام حاصل ہو بلکہ ان پر بھی ہوتا ہے جنھیں ریاست یا عوام کا کوئی طبقہ پسند اور قبول نہ کرے۔ اس تنوع (Pluralism) رواداری (Tolerance) اور وسعت نظری (Broad mindedness) کے بغیر کوئی معاشرہ 'جمہوری' نہیں ہوسکتا۔

کیا قارئین سمجھ گئے ہیں کہ جسٹس صاحب ٹالرینس پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟ ان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو ARY کے ایک فحش اور بیہودہ ڈرامہ دکھانے پر بُرا نہیں منانا چاہیے۔عوام اسے غلط سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں لیکن وہ تو اسے ٹھیک سمجھتے ہیں لہٰذا آپ اس اختلاف رائے کو برداشت کریں کیونکہ یہ 'جمہوریت' کا حسن ہے۔ (یعنی مغربی جمہوریت کا)۔

جناب عالی! یہ ٹالرینس کا مغربی تصور ہے کہ دوسرے جو کرتے ہیں انہیں کرنے دو، یہ ان کی پرائیویسی ہے، یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے، جو وہ چاہیں وہ کریں آپ انہیں کرنے دیں۔ اور آپ جو چاہیں وہ کریں، کوئی آپ کو نہ ٹوکے، کوئی آپ کے خیالات اور اعمال سے متفق نہ بھی ہو، تو وہ آپ کو نہ ٹوکے۔ یہ ہے ٹالرینس کا مغربی تصور؛ لیکن اسلام کا تصور ٹالرینس اس سے بالکل مختلف ہے۔قرآن وسنت یہ نہیں کہتے کہ جب تم کوئی بُرا کام ہوتے دیکھو تو اسے ٹالریٹ کرو بلکہ قرآن کہتا ہے کہ لوگوں کو اچھے کام کرنے کو کہو اور اگر کوئی غلط اور بُرا کام کرے تو اسے روک دو۔اسے قرآن کی اصطلاح میں کہتے ہیں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر''۔اور یہ

قرآن کی رو سے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾[آل عمران ۳:۱۱۰]

''اور دیکھو، تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔''

اور یہ ہر مسلمان حکومت کی بھی ذمہ داری ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾[الحج ۲۲:۴۱]

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم ملک میں اقتدار دیں تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور سب کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔''

اور یاد رہے یہ نہیں کہا کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ترغیب دو اور بُرے کاموں سے بچنے کی فہمائش کرو بلکہ کہا کہ نیک کاموں کا ''حکم'' دو اور برائی سے ''روک دو''۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہاں ممکن ہو برائی کو ہاتھ سے روک دو، ورنہ زبان سے روکو اور یہ بھی نہ کر سکو تو اسے دل میں ضرور بُرا سمجھو اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔

"مَن رَأَى مِنكُم مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بيَدِهِ، فإنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسانِهِ، فإنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وذلكَ أضْعَفُ الإيمانِ."[۱]

اور فرمایا کہ اگر حکمران جابر اور ظالم ہو تو اسے ظلم سے روکنا 'جہاد' ہے۔

"أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر."[۲]

اس کی وجہ یہ ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں[۳] اور وہ سب ایک دوسرے کے خیر

---

[۱] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۹

[۲] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۴۳۴۴

[۳] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۴۴۲

خواہ ہیں اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بھائی کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔

"لا یؤمن احد کم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ۔"[۱]

چنانچہ ہر مسلمان چاہتا ہے کہ وہ دین پر عمل کرے اور جہنم کی آگ سے بچ جائے اور یہی وہ ہر مسلمان کے لیے چاہتا ہے چنانچہ جب وہ اسے کوئی معصیت اور گناہ کرتے دیکھتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اسے ٹوکے، اسے متنبہ کرے اور ہو سکے تو اسے روکے۔ اس کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا کہ تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور جس کی جو ذمہ داری ہے وہاں وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، باپ اپنے خاندان کا ذمہ دار ہے، ماں اپنی اولاد کے لیے ذمہ دار ہے، حکمران رعایا کے لیے ذمہ دار ہے۔

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْؤُولَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدِهِ وَهُوَ مَسْؤُولٌ عَنْهُ أَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ."[۲]

"حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خبردار ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحت افراد (رعایا) کے بارے میں پوچھا جائے گا (یعنی ہر کوئی ذمہ داری کا جوابدہ ہوگا)۔ لہٰذا امام لوگوں کی طرف سے نگران ہے اور اس سے اُن لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جو اُس کے ماتحت تھے اور ہر آدمی اپنے گھر والوں کا نگران ہے اور اُس سے اُس کے ماتحت افراد کے بارے میں پوچھا جائے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کے لیے نگران ہے اور اُس سے اُن کے بارے میں پوچھا جائے گا اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اور اُس سے اُس کے

---

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۳

[۲] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۷۱۹

بارے میں پوچھا جائے گا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کے ماتحت افراد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

قرآن وسنت کے احکام تو یہ ہیں کہ دس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی بیٹا اگر نماز نہ پڑھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے مار کر نماز پڑھاؤ[۱] اور قرآن کہتا ہے کہ بیوی اگر نشوز اور سرکشی پر اُتر آئے تو اسے مارا جا سکتا ہے۔[۲]

تو جناب عالی! یہ ہے اسلام کا تصور ٹالرینس کہ بُرائی کو روکو۔ اگر جسٹس صاحب اسلام کے تصور ٹالرینس سے واقف ہوتے تو مغرب کے "جمہوری" تصور ٹالرینس کو غلط سمجھتے اور وہ کبھی ARY کو فحش اور بیہودہ ڈرامہ آن ایئر کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

۶۔ پیمرا آرڈیننس اور کونسلز آف کمپلینٹس میں جہاں قابل نشر مواد پر ممکنہ پابندیوں کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں کہیں بھی اسلام اور اسلامی تعلیمات کی پابندی یا ان کی مخالفت نہ کرنے کا ذکر نہیں صرف Commonly accepted moral Standards کا ذکر ہے۔ پھر دفعہ 26(3) میں جہاں معزز شہریوں پر مشتمل کونسل آف کمپلینٹ کے ارکان کا ذکر ہے، وہاں پانچ رکنی ٹیم میں شرط ہے کہ دو خواتین ہوں۔ یہ کہیں ذکر نہیں کہ ان میں سے ایک دین کا عالم بھی ہو کیونکہ جب مسلمانوں کا معیار (Normative standard) اسلام ہے تو اسلامی علوم کے کم از کم ایک ماہر کا ہونا تو وہاں ضروری ہے جو ٹیم کے باقی ارکان کی رہنمائی کر سکے کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی۔ بلکہ ہم تو کہیں گے کہ پیمرا کے چیئرمین اور کونسلز آف کمپلینٹس کے ہیڈ کو ایسا عالم دین ہونا چاہیے جو صحافت اور نشر و اشاعت کا علم اور تجربہ بھی رکھتا ہو۔

یہ چند گزارشات تھیں جو ہم سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے متعلق مسلمان عوام وخواص کے سامنے رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان پر حقیقت واضح ہو جائے اور اس فیصلے کا اسلامی لحاظ سے مخدوش ہونا ان پر واضح ہو جائے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین۔

---

[۱] سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۹۵

[۲] النساء ۴: ۳۴

فقہ وقانون

ڈاکٹر محمد امین

پارلیمنٹ سپریم ہے یا عدلیہ؟
اسلامی نقطۂ نظر

مغربی جمہوریت میں

مغرب کے سیاسی نظام کے چند اہم ادارے یہ ہیں: ڈیموکریسی (جمہوریت)، عوام کی حاکمیت (Sovereignty)، ریاست (State)، قومی ریاست (Nation State)، نیشنلزم (وطن پرستی)، آئین سازی (Constitutionalism)، نظام حکومت کی تین بنیادی شعبوں (مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ) میں تقسیم اختیارات، نمائندگی کا تصور۔

مغرب کی آئیڈیالوجی خصوصاً ہیومنزم کی رو سے انسان/ فرد خود مختار اور آزاد ہے، وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے۔ ریاست کا نظام چلانے میں وہ کسی مذہب/ دین (Religion) کا پابند نہیں ہے۔ لہٰذا عوام (مجموعۂ افراد) یا ان کے نمائندے بھی فرد کی طرح خود مختار اور آزاد ہیں کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے نظامِ حیات کا تعین کریں، ریاست چلانے کے لیے خیر وشر، حق وباطل، اوامر ونواہی، حلال وحرام کا تعین کریں اور ریاست وحکومت چلانے کے اصول وقواعد وضع کریں۔ ریاست وحکومت چلانے کا انحصار چونکہ آئین پر ہوتا ہے لہٰذا آئین کو مقدس گردانا جاتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی ریاست کے خلاف بغاوت گردانی جاتی ہے۔

مغربی جمہوریت میں پارلیمنٹ اس لیے سپریم سمجھی جاتی ہے کہ وہ فرد/ افراد/ عوام کے نمائندوں کے مل بیٹھ کر آئین اور قانون سازی کی جگہ ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ مغرب کی بنیادی آئیڈیالوجی (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم) کی رو سے فرد/ افراد/ عوام خود مختار اور ساورن ہوتے ہیں لہٰذا پارلیمنٹ جو ان کے خود مختار نمائندوں کے مل بیٹھنے اور آئین وقانون بنانے کا ادارہ ہے، اسے بھی خود مختار اور ساورن سمجھا جاتا ہے اور اسے سپریم کہا جا سکتا ہے لیکن .... مغرب کی جمہوریت میں نظامِ حکومت کو تین شعبوں، انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ عدلیہ کو اس لحاظ سے انتظامیہ اور مقننہ پر برتری حاصل

ہوتی ہے کہ وہ انتظامیہ کے فیصلوں کو اور مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کو اس بنیاد پر غلط قرار دے سکتی ہیں کہ وہ آئین کے خلاف ہیں یا انتظامیہ اپنے دائرۂ کار میں آئین پر جس طرح عمل کرے یا مقننہ جو قانون سازی کرے، عدلیہ اسے آئین کی غلط تشریح کہہ کر ردّ کر سکتی ہے۔ گویا آئین یا قوانین کی جو تشریح اور وضاحت عدلیہ کرے اس پر انتظامیہ اور مقننہ عمل کرنے کی پابند ہے۔

خلاصہ یہ کہ عدلیہ مقننہ کے بنائے ہوئے آئین کی پابند ہے اور انتظامیہ و مقننہ آئین کی تشریح و تطبیق میں عدلیہ کے پابند ہیں لہٰذا مقننہ اپنے دائرے میں سپریم ہے لیکن وہ عدلیہ پر غالب نہیں ہے اور عدلیہ اپنے دائرے میں سپریم ہے کہ وہ انتظامیہ اور مقننہ کے تحت نہیں ہے لہٰذا پارلیمنٹ اور عدلیہ میں کوئی تقابل اور مسابقت ممکن نہیں ہے۔ تاہم اگر لفظی بحث سے بچنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ عملی میدان میں عدلیہ کو مقننہ اور انتظامیہ پر برتری حاصل ہوتی ہے یا یہ کہ عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ کے مقابلے میں سپریم ہے۔

اسلامی تناظر

دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان ممالک آزاد ہوئے تو مغربی استعمار کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے مسلم حکمرانوں نے علماء سے مل کر اسلام کے سیاسی نظام کی تعمیر نو کی کوشش کرنے کی بجائے ان کے سیاسی نظام (جمہوریت، آئین، انتخابات، ریاست، قومی ریاست، آئین سازی، نیشنلزم) کو اس کے غیر اسلامی ہونے کے باوجود قبول کر لیا اور اس کا برا نتیجہ بھی وہ بھگت رہے ہیں کہ وہ اسلامی نظام حیات خصوصاً اسلام کے سیاسی اصولوں سے دور ہونے کی وجہ سے سیاسی و معاشی عدم استحکام سے دوچار ہیں اور مسلم معاشرے اور ریاستیں دینی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی، عدالتی، تعلیمی، قانونی.... بحران میں مبتلا ہیں۔

اسلامی نظریات وعقائد (عقیدہ، عبادات، اخلاقیات، معاملات) نہ صرف مغربی آئیڈیالوجی اور افکار سے مختلف ہیں بلکہ اس سے متضاد ہیں۔ اسی طرح مغرب کا ورلڈ ویو (انسان خود مختار اور آزاد ہے، وہ کسی خدا کا عبد نہیں، رسول کوئی نہیں ہوتا اور نہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور نہ آخرت کسی نے دیکھی ہے) اسلام کے ورلڈ ویو (توحید، رسالت آخرت، وحی) کے بالکل برعکس ہے لہٰذا ان دو مختلف پیراڈائمز کو یکجا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ایک پیراڈائم کے تحت

بننے والے علوم اور ادارے دوسرے پیراڈائم کے کام آسکتے ہیں، اس کے مطابق ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام میں نہ مغربی طرز کی جمہوریت ہے، نہ مغربی طرز کا آئین ہے، نہ وہاں ریاست، قومی ریاست اور نیشنلزم ہو سکتا ہے۔

اسلام میں آئین قرآن وسنت ہیں۔ قانون سازی کی بجائے اجتہاد کا ادارہ ہے جو مسلمان اہل علم/فقہاء/مجتہدین کی ذمہ داری ہے۔ عدلیہ اسلامی فقہ واصول فقہ کے ماہرین پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ سارے فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کے جج/قاضی حضرات مجتہد ہوتے ہیں اور وہ انتظامیہ اور اجتہادیہ (مجلس اجتہاد) کے اعمال وافعال کو، اگر خلاف قرآن وسنت سمجھیں، تو انہیں ختم کر سکتے ہیں۔ گویا اسلامی حکومت/امارت/خلافت (ہم ریاست کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس کا تصور خود غیر اسلامی ہے) میں کوئی پارلیمنٹ نہیں ہوتی اور نہ وہ سپریم ہوتی ہے کیونکہ اسلام میں فرد/افراد/عوام حاکمیت کے حامل نہیں ہوتے بلکہ سب اللہ کے عبد ہوتے ہیں، حاکمیت اور ساورنٹی صرف اللہ کے لیے ہے اور یہ بالواسطہ اس کی وحی/آئین/قانون/قرآن وسنت/شریعت کو حاصل ہے۔ حکمران ہوں، سیاستدان ہوں، اجتہادیہ ہو، نظام قضا ہو، عاملین (بیوروکریسی) ہوں، سب اللہ کے قانون/شریعت کے پابند ہوتے ہیں۔ گویا اسلام کے سیاسی نظام میں سپریم اللہ کا قانون/شریعت ہوتی ہے اور عدلیہ کو اجتہادیہ وانتظامیہ پر بایں معنی سپرمیسی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان کے اعمال وافعال کو خلاف شریعت قرار دے سکتی ہے۔ لہٰذا اسلام کے سیاسی نظام میں مغرب کی طرز کی کوئی پارلیمنٹ نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ سپریم ہوتی ہے اور عدلیہ چونکہ اجتہادیہ اور انتظامیہ کے اعمال وافعال کو خلاف شریعت کہہ کر رد کر سکتی ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں بھی عدلیہ کو انتظامیہ واجتہادیہ پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔

ممکن ہے ہماری باتیں لوگوں کو عجیب لگیں اس لیے ہم مسلم تاریخ سے چند مثالیں دے کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو ایک آدمی ملا اور اس نے اپنا معاملہ بتایا۔ آپ نے اسے مدینہ کے قاضی حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس بھیجا۔ قاضی نے فریقین کا مؤقف سنا اور فیصلہ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہی آدمی حضرت عمرؓ کو نظر آ گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے معاملے کا کیا بنا؟ اس نے کہا میں قاضی کے پاس گیا تھا اور انہوں نے یہ فیصلہ

کیا۔آپ نے کہا اگر میں ہوتا تو اس کی بجائے فیصلہ یوں کرتا۔اس نے کہا آپ امیر المومنین ہیں۔آپ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے کہا: یہاں بات قرآن وسنت کی نہیں، اجتہادی رائے کی ہے۔قاضی کی بھی ایک رائے ہے اور میری بھی ایک رائے ہے لیکن فیصلہ قاضی کی رائے پر ہوگا نہ کہ میری رائے پر؛ کیونکہ وہ قاضی ہے۔

اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوگئی اور آپ نے اسے ایک یہودی کے پاس دیکھ لیا آپ نے قاضی (شریحؒ) کی عدالت میں مقدمہ کردیا اور ایک عام سائل کی طرح قاضی کے پاس پیش ہوئے۔قاضی نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اپنے مؤقف کے حق میں گواہ پیش کریں۔آپ نے حضرت حسنؓ کو گواہ کے طور پر پیش کیا۔قاضی نے بیٹے کی باپ کے حق میں گواہی قبول کرنے سے انکار کردیا اور مدعی کے پاس مزید ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ یہودی کے حق میں کردیا، حالانکہ اسے پتا تھا کہ نہ حضرت علیؓ خدانخواستہ جھوٹ بول رہے ہیں اور نہ حضرت حسنؓ۔لیکن اس کے باوجود حضرت علیؓ نے امیر المومنین یعنی انتظامیہ کا سربراہ ہونے کے باوجود اور اس امر کے باوجود کہ وہ بھی مجتہد تھے، قاضی کا فیصلہ قبول کرلیا۔ان دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ اسلام میں بھی عدلیہ کو انتظامیہ اور اجتہادیہ پر برتری حاصل ہے۔

بقیہ: نفس لوّامہ کی تلاش

اس موازنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمؑ پر نفس لوّامہ کا غلبہ ہوا اور ابلیس اس سے محروم رہا چنانچہ آج تک نفس لوّامہ آدمیت اور ابلیسیت میں فرق کرتا ہے۔

اس وقت انسانیت کو جو بحران درپیش ہے وہ نفس لوّامہ کے گم ہوجانے کا بحران ہے۔ ہمارے معاشرتی سانچوں خصوصاً میدان سیاست میں اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرنا، اپنے کیے پر ڈٹے رہنا اور اسی کو درست ثابت کرنے میں لگے رہنا ہی کامیابی کی کلید سمجھا جانے لگا ہے:

اب ضمیروں میں ندامت کی روش ختم ہوئی
تھی ہوا تیز، نہ ماتھوں پہ پسینہ ٹھہرا

آیئے مل کر اس کی کھوئی ہوئی شے کی جستجو کریں۔

تفہیم مغرب/مکالمہ

ڈاکٹر رشید ارشد[1]

جدیدیت کی آئیڈیالوجی غیر اسلامی ہے

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی انٹرنیشنل کانفرنس میں گفتگو

[البرہان کا تبصرہ دیکھیے مضمون کے آخر میں]

۱۔ جدیدیت کو اگر آپ ماڈرنائزیشن کہہ رہے ہیں اور جدت کو آپ موڈرنٹی کہہ رہے ہیں تو بنیادی طور پر ایک فرق یہ ہے کہ موڈرنٹی ایک پرنسپل ہے اور ماڈرنزم اس کا اسٹرکچر، اس کا سسٹم ہے۔ پھر آپ نے یہ کہا کہ جدیدیت اور روایت میں باہمی نسبت کیا ہے؟ تو جیسے خورشید ندیم صاحب نے فرمایا کہ یہ جو نیاپن ہے، نولٹی ہے یا ایروآف ٹائم جسے کہا جاتا ہے جس میں ایک چیز آگے ہے اور ایک پیچھے ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری صدی قدیم ہے اور چوتھی صدی اس کے مقابلے میں جدید ہے۔ جیسے یہ ہمیں معلوم ہے کہ جدیدیت ایک تاریخی مظہر ہے۔ اس تاریخی عمل کے نتیجے میں کچھ فکری تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اس کا آغاز تحریک نشأة ثانیہ سے ہوا اور وہ مکمل ہوئی تحریک تنویر پر پہنچ کر اور اس کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی میں اس کے اسٹرکچر وجود میں آئے۔

۲۔ سوال یہ تھا کہ روایت اور جدیدیت میں باہمی نسبت کیا ہے؟

جیسے روایت کا لفظ ہے اس کو بہت سارے لوگوں نے problematize کیا ہے اور Invention of Tradition کا ایک تصور ہے کہ یہ روایت خود ایجاد کی گئی ہے اور جیسے ایک بائنری بنائی جاتی ہے اور اپنا ایک other تشکیل دیا جاتا ہے تو موڈرنٹی نے اپنا ایک other پیدا کیا اور اس کو جسے اس نے ٹریڈیشن کا نام دے دیا۔ اور ایک لحاظ سے جیسے یہ ایک ویلیو ججمنٹ بھی ہے یعنی نئے ہونے کا مطلب ہے معیاری ہونا، اچھا ہونا اور پرانے ہونے کا مطلب ہے پسماندہ ہونا۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہر وہ چیز جو نئی ہے وہ برتر ہے اس سے ایک تصور یہ بھی نکلا کہ ان کے ہاں Is/Ought کی dichotomy آہستہ آہستہ ختم ہوگئی اس کو Fact/Value distinction بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز موجود ہے اور

---

[1] شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب، لاہور

وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے گویا اس کے اندر ایک ویلیو بھی ہے۔ ہمارے ہاں کے ایک مفکر ہیں وہ یہ کہتے ہیں: کہ ہر دور قرآن کا دور ہے۔اس کا مطلب کیا ہے؟ دنیا جہاں بھی جارہی ہے اور جتنی بھی ترقی کر رہی ہے یہ اصل میں قرآن کے اصولوں ہی کا خارجی اظہار ہے۔اقبال کے اشعار میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔اسی بات کو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب بھی اپنے انداز میں ذکر کرتے ہیں۔یہ مفکر اسی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ دنیا جہاں تک پہنچے گی یہ سائنس،ٹیکنالوجی،تمدن اور ادارہ جاتی صف بندی، یہ سب اصل میں قرآن مجید ہی کا فیضان ہے۔اس لحاظ سے پھر وہ لوگ جو اپنے آپ کو روایتی کہتے ہیں ان کے اندر جدیدیت کے حوالے سے کوئی نکارت نہیں ہونی چاہیے۔اور جیسے یوں کہا گیا کہ ﴿هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا﴾ اس مؤقف کے مطابق اقبال نے جن لوگوں کو مشرق کے مسکین قرار دیا ہے، ان کو مغرب سے آنے والی ہر چیز کو بہت شکر گزاری کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔اور اصل میں تو ہم تھے جو دنیا کو آگے لے جانا چاہتے تھے۔جنہوں نے سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کی، وہ ہم تھے۔جنہوں نے تمدن پیدا کیا وہ بھی ہم ہی تھے۔پھر ہم کسی سبب سے سو گئے اور مغرب والے جاگ گئے۔اگر ہم اہل مغرب سے جدیدیت کی اقدار اور ان کے ثقافتی اوضاع کو لیتے ہیں تو کسی اجنبی (Alien) چیز کو اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ ہماری گم شدہ متاع تھی اور ہم اسے Reclaim کرتے ہیں۔

۳۔ اگلا سوال آپ کا یہ تھا کہ روایت کیا ہے؟ تو روایت کی نسبت دین کا لفظ زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح تہذیب کا لفظ ہے تو بہت سارے لوگ تہذیب کے لفظ کو پرابلمٹائز کرتے ہیں کیوں کہ یہ بجائے خود ایک نیا تصور ہے۔تہذیب کی بجائے ہمارے ہاں دین کی اصطلاح ہے۔اسی طرح روایت کی بجائے علوم نبوت کی اگر ہم بات کریں تو وہ زیادہ ٹھیک (Appropriate) ہے۔تو اصل جو تصادم ہے وہ دین اور بے دینی کا ہے یا اس پیراڈائم کا فرق ہے کہ ایک وہ لوگ ہیں جن کا اصل فوکس اور علیت کی بنیاد غیب ہے اور کچھ وہ لوگ ہیں جن کی علیت کی بنیاد صرف شہود ہے۔اسی طرح موڈرنٹی کا جہاں سے آغاز ہوا جس رائے کو میں ٹھیک سمجھتا ہوں وہ nominalism ہے اور وہ بنیادی طور پر یونیورسلز کا انکار ہے۔وہاں سے بات شروع ہو کر یہاں تک آتی ہے جہاں ہم اس کو بھگت رہے ہیں۔

۴۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی فکر کے تناظر میں جدیدیت کو سمجھنے کا معیاری طریقہ کیا ہے؟

تو وہ کسی بھی تناظر میں ہو، کوئی بھی نظریہ علم جو ہے اس کو دیکھنے کا معیاری طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی وجودیات کو دیکھا جائے جس کو Ontology کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی Epistemology کو دیکھا جائے، جس کو علمیت کہتے ہیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ اقدار کیا پیدا کر رہے ہیں جسے Axiology کہتے ہیں، اخلاقیات، جمالیات وغیرہ۔ تو جدیدیت کا سب سے بڑا اثر ہمارے سماج پر اقداری سطح پر ہے۔ اگر آپ مغرب کے نظریات کو تھوڑا unveil کر کے بتائیں تو آدمی کہے گا یہ تو کفر ہے اور باطل کے سوا اس پر کوئی حکم نہیں لگتا لیکن وہ اقدار، ادارہ جاتی صف بندی میں ہمارے اندر بالکل Internalize ہو گئی ہیں۔ ہم اصولوں کا تو انکار کر رہے ہیں لیکن اقدار کو قبول کئے ہوئے ہیں اور زندگیوں میں اپنائے ہوئے ہیں اور جیسے اکبر نے کہا تھا کہ ؎

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

انہوں نے ہماری طبیعت کو، ہمارے مزاج کو، اور ہمارے ذوق کو بدل دیا ہے۔ میکالے نے کہا تھا کہ ہم ان کے ذہن، اقدار اور ذوق کو بدل دیں گے، ہاں اپنی رنگت اور نسل کو تو وہ بدل نہیں سکتے۔

۵۔ تو اگلی بات یہ ہے کہ جدیدیت کے ہماری مذہبی فکر پر کیا مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

مثبت تو بہت مشکل ہیں۔ مجھے مشتاق یوسفی صاحب کی بات یاد آگئی کہ وہ کسی کا تعزیت نامہ لکھ رہے تھے تو انہوں نے ازراہ تفنن لکھا کہ مرحوم میں بہت سی خرابیاں اور عیوب تھے اور یقیناً کچھ خوبیاں بھی ہوں گی لیکن وہ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود یاد نہیں آ رہیں۔ تو یہی بات ہے کہ جدیدیت میں کوئی خیر نہیں ہے، نہ اس کے اصول میں، نہ اس کے مظاہر میں۔ اس کے اصول بالکل ہمارے دین سے مخاصم ہیں۔ ان کا جو اسم اعظم ہے وہ آزادی ہے جبکہ ہماری اصل بندگی ہے۔ ان کے ہاں علم کی بنیاد انسانی حواس و عقل ہیں جیسے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم انسانی استعداد کا زائدہ علم کہتے تھے اور ہمارے ہاں علم بالوحی ہے۔ ان کے ہاں دنیا کی ترقی مقصود ہے اور ہمارے ہاں آخرت کی نجات مقصودِ قصوی ہے۔ تو ایک لحاظ سے تو یہ اپنی اصل میں بھی باطل ہے اور مظاہر میں بھی باطل ہے اور اب اہل مغرب کے ہاں بھی جس

ہیومن ازم سے انہوں نے آغاز کیا تھا اس وقت وہ انسان ہی اصل میں معرضِ خطر میں ہے۔ اور اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ انسان غائب ہو جائے گا۔ خدا کی موت (معاذ اللہ) انسان کی نابودیت پر منتج ہو گی۔ ہر سال ورلڈ فلاسفی ڈے منایا جاتا ہے ۲۰۲۲ء کا تھیم تھا: ''The forth coming human'' یعنی اب ایک نیا انسان پیدا ہو گا اور چونکہ مغرب کے ہاں جدید انسان کے دو ہی ماڈل ہیں: یا تو وہ مشین ہے یا وہ حیوان ہے۔ وہ جو جون گرے نے کہا تھا کہ یہ جو تصور ہے جدید ہیومن ازم کا یہ ممکن نہیں ہے مغرب کے پیراڈائیم میں۔ ہیومن ازم کا ایک ہی مطلب تھا ایک ہی اس کا سبب تھا وہ بائبل کا یہ جملہ تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ یہاں جدید مغرب نے انسان کو حیوان پر اور جبلتوں پر ریڈیوس کر لیا اور اب شرفِ انسانیت کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ بہر حال وہاں اب انسان ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے؟ یہی معرض بحث میں ہے۔

۶۔ اچھے تعلق کی صورت کیا ہونی چاہیے؟

سب سے بڑی صورت تو یہ ہے کہ اس کے شر سے بچا جائے۔ اب سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے فزیکل اسٹر کچر کے شر سے کیسے بچیں اور ان کی اقدار جس طرح آ رہی ہیں وہ جس طرح Inculcate کر رہے ہیں اس سے ہمیں کیسے بچنا ہے؟ اور چونکہ ڈائیلاگ ختم ہو چکا ہے۔ میکنٹائر نے چالیس برس قبل کہہ دیا تھا کہ موڈرنٹی میں ڈائیلاگ ممکن ہی نہیں ہے اور وجہ یہ کہ وہ طاقت اساس ہے۔ گفتگو گپ شپ ہوتی ہے اور وہاں پر فکر کی آزادی ہے، رائے کی آزادی ہے، عمل کی آزادی نہیں ہے۔ گپ شپ آپ کریں آپ کو کچھ نہیں کہیں گے جیسے ہم یہاں بیٹھ کر کر رہے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں کوئی پاور اسٹر کچر بنا دیں یہ ممکن نہیں۔

۷۔ آخری سوال یہ ہے کہ یہ کیا جدیدیت ایک ہی عملی نمونہ ہے؟ تو multiple modernity کی بات ہوتی ہے تو جیسے دین ہے اور مکاتب فکر ہیں۔ اسلام دین ہے اور مکاتب فکر حنفی، مالکی اور شافعی ہیں۔ اسی طرح جدیدیت کا دین ایک ہی ہے اور اس کے مکاتب فکر ہیں جیسے لبرلزم، ہیومن ازم، مارکسزم وغیرہ تو یہ فرق تو رہے گا، لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے جو ایک خاص قسم ہے جدیدیت کی وہ استعماری جدیدیت ہے۔ یورپی جدیدیت اور ہے، استعماری جدیدیت اور ہے، انہوں نے جو اقدار اپنے ہاں Inculcate کیں وہ اپنی کالونیز میں کبھی Promote نہیں کیں۔ یہ بھی ایک تضاد ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔

البرہان

* مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ڈاکٹر رشید ارشد صاحب نے اس بات کو غلط سمجھا کہ ان کا مؤقف اسلام اور جدیدیت کے حوالے سے 'بین بین' قرار دیا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کے ناقد ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔

* اگر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب پر نقد کے حوالے سے میرے اور ان کے اسلوب میں کوئی اختلاف ہے بھی تو یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ ہم اس پر آپس میں الجھیں۔ ایک کام کرنے کے کئی اسالیب اور مناہج ہو سکتے ہیں اور ہر اسلوب کی کچھ خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ میں عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے لکھتا ہوں جو سادہ اور عام فہم ہو۔ ڈاکٹر صاحب فلسفے کے آدمی ہیں اور بات کہنے اور کرنے کا ان کا اپنا ایک علمی اسلوب ہے۔

* میرے نزدیک ریڈ لائن تجدد ہے جو گمراہی ہے۔ تجدد یہ ہے کہ آپ اسلام کو ویسٹرنائز کریں اور ویسٹ کو اسلامائز کرنے کی کوشش کریں۔ دین کی نئی تعبیر کریں اور یہ سمجھیں کہ دین کو پچھلے چودہ سو سال میں کوئی نہیں سمجھا سوائے میرے۔ یہ بات روایت کے خلاف ہے اور ناقابل قبول ہے۔ اگر کوئی اسے جدت یا جدیدیت سمجھتا ہے تو وہ غلط ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ڈاکٹر رشید ارشد صاحب ایسے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ میری رائے میں تو وہ روایت کے آدمی ہیں اور قیمتی آدمی ہیں۔ مخلص ہیں اور دین کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔

* جب آپ پبلک میں کام کرتے ہیں تو کچھ لوگ آپ کے ہم خیال ہوتے ہیں، آپ کے کام کو سراہتے ہیں۔ کچھ لوگ آپ سے اختلاف کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ آپ کے مؤقف کو سمجھ نہ سکیں یا خواہ مخواہ کی مخالفت پر اُتر آئیں۔ پبلک لائف میں یہ سب ہوتا ہے۔ آپ کے اکابر میں سے ڈاکٹر اسرار احمد اور احمد جاوید صاحب کے بہت سے لوگ مداح ہیں اور بعض لوگ بوجوہ ان کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ مخالفت پر سیخ پا اور مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ درگزر کرنا چاہیے، صبر کرنا چاہیے، ضرورت سمجھیں تو اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دیں۔ مخالفین سے الجھنا نہیں چاہیے۔ اپنے کام میں لگے رہیے۔ جس کام کو آپ مثبت سمجھتے ہیں اپنی توانائیاں اس کے لیے وقف رکھیے۔ مدیر

تفہیم مغرب/مکالمہ حافظ محمد عمران طحاوی

کیا جدیدیت قابل ردّ نہیں؟

ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کے مؤقف کا تجزیہ

راقم کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے فکر اسلامی کی کانفرنس (منعقدہ ۱۳، ۱۴ مارچ ۲۰۲۳ء) میں حاضری کا موقعہ ملا جس کا موضوع روایت، جدت اور جدیدیت تھا۔ اس ضمن میں میرا مؤقف وہی ہے جو استاذ محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب کا ہے کہ جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے ہمارا دینی مؤقف تین طرح کا ہوسکتا ہے اور عملاً ہے۔ ایک یہ کہ جدیدیت کو قبول کرلیا جائے، دوسرا یہ کہ اسے ردّ کردیا جائے اور تیسرا یہ کہ ان دونوں کے درمیان ''بین بین'' مؤقف اختیار کیا جائے۔ کچھ مغرب کی تعریف وتوصیف کردی جائے، کچھ اسے مطابق اسلام قرار دیا جائے، کبھی اسے قبول کرنے والے متجددین کی تعریف کردی جائے، کبھی اسے خُذ ما صَفا ودَع مَا کَدِرَ قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام سے وابستگی کا اظہار بھی کیا جائے اور کبھی جدیدیت کو غلط اور غیر اسلامی بھی قرار دیا جائے۔

کانفرنس سے واپسی پر مَیں نے انتہائی مختصر، صرف ایک صفحے کی، ایک تاثراتی تحریر لکھی کہ کانفرنس میں ان تینوں رجحانات کی نمائندگی موجود تھی۔ کانفرنس کے افتتاحی اور اختتامی اجلاس میں بیرون ملک سے ایسے پاکستانی سکالر عمداً منگوائے گئے جو تجدد کے حامی تھے۔ مقامی متجددین میں سے ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو ہر جگہ آگے رکھا گیا۔ پینل ڈسکشن میں بھی اسی رجحان کے جناب خورشید ندیم صاحب نے گفتگو کی۔ ڈاکٹر رشید ارشد صاحب، ڈاکٹر مبشر حسین صاحب اور ڈاکٹر فیروز الدین کھگہ صاحب کے مؤقف کو مَیں نے بین بین سمجھا اور ڈاکٹر انیس صاحب اور ڈاکٹر محمد امین صاحب کو میں نے جدیدیت کو ردّ کرنے والوں میں سے سمجھا۔ پینل ڈسکشن کو سمیٹتے وقت ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کے علاوہ ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب، ڈین وصدر شعبہ فکر اسلامی ڈاکٹر محی الدین ہاشمی صاحب کو بھی مَیں نے بین بین بلکہ مائل بہ تجدد سمجھا اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ یہ ایک مختصر تاثراتی تحریر تھی اور مَیں نے کسی سکالر کے

مؤقف یا استدلال کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا اور نہ یہ پیش نظر تھا۔

میری تحریر شائع ہونے پر مجھے کسی طرف سے کوئی ردِّ عمل موصول نہیں ہوا سوائے ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کے جنہوں نے میرے ایک جملے کو جس میں مَیں نے انہیں بَین بَین والے لوگوں میں شمار کیا تھا، سخت غصے اور ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے تہمت، بہتان اور صریح کذب بیانی قرار دیا۔ مَیں نے مدیر البرہان سے کہا کہ مَیں ڈاکٹر صاحب سے معذرت کر لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں یہ میری ذمہ داری ہے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت کی کہ آئندہ ہم مزید محتاط رہیں گے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کا غصہ اور تلخی کم نہ ہوئی، انہوں نے اوپن یونیورسٹی سے اپنی تقریر کا کلپ منگوایا، اسے ٹرانسکرائب کرایا اور مدیر البرہان کو بھیجا کہ بتاؤ مَیں نے کہاں ''بَین بَین'' والا رویہ اختیار کیا ہے مَیں نے تو جدیدیت کے خلاف بات کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مَیں ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کی بہت تکریم کرتا ہوں۔ وہ بہت فاضل شخص ہیں، اخلاص سے دین کی خدمت کر رہے ہیں اور میرے لیے ہر لحاظ سے قابل احترام ہیں لیکن ان کے بہت سخت رویے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اور بادل نخواستہ اب ان کی گفتگو کا جائزہ لینا پڑے گا اور بتانا پڑے گا کہ کیوں مَیں نے انہیں ''بَین بَین'' والے لوگوں میں شمار کیا کہ بعض اوقات لکھنے یا بولنے والا روٹین میں اپنے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے اور اسے شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ یا لکھ رہا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ مَیں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریر کو پیراگراف نمبر لگا دیئے ہیں اور انہی کے ریفرنس سے بات کروں گا۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریر (تقریر) کے پہلے پیراگراف میں جدیدیت کے حامیوں کے اس مؤقف کو ردّ نہیں کیا کہ ماڈرنزم سے مراد جدیدیت ہے اور ماڈرنٹی جدت ہے بلکہ اسے قبول کرتے ہوئے اور اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ماڈرنٹی پرنسپل ہے اور ماڈرنزم اس کا سٹرکچر ہے حالانکہ متجددین ماڈرنٹی کا ترجمہ جدت اس لیے کرتے ہیں کہ اسے اسلامی لحاظ سے قابل قبول گردانا جائے کیونکہ اسلام جدت کو قبول کرتا ہے جب کہ وہ

جدیدیت کو رد کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے بالواسطہ متجددین کی بات کو آگے بڑھایا اور اس کا رد کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ جدیدیت ایک اصطلاح ہے اور جدت کو لغوی لحاظ سے اس کے ساتھ ملحق نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ پیراگراف ۲ میں ڈاکٹر رشید ارشد صاحب نے کسی مفکر کے اس قول کو آگے بڑھایا ہے کہ مغرب جو کچھ کر رہا ہے وہ گویا قرآن ہی کے اصولوں کا خارجی اظہار ہے اور یہ گویا ﴿هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ﴾ کے مصداق ہے۔ یہ مؤقف بھی متجددین کا ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کے مظاہر ونتائج کو اسلامی ثابت کیا جا سکے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو مسلمانوں کے لیے بلا تردد قابل قبول باور کرایا جائے کہ یہ تو عین اسلامی ہیں لہٰذا انہیں قبول کر لینا چاہیے۔

۳۔ تیسرے پیراگراف میں ڈاکٹر صاحب نے آغاز ٹھیک کیا اور بتایا کہ اسلام اور جدیدیت میں حقیقی فرق دینی اور بے دینی کا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دو تین باتیں ایسی کہہ دیں جو فکری انتشار کی طرف لے جاتی ہیں۔ ایک تو انہوں نے فرمایا کہ اسلامی اور مغربی علمیت میں فرق غیب اور شہود کا ہے۔ حالانکہ بنیادی فرق غیب اور انکار غیب کا ہے جو کفر کو مستلزم ہے۔ مسلم روایت میں 'شہود' کا جو تصور ہے اسے مغرب کے تجربہ ومشاہدہ کو معیار حق سمجھنے کے مترادف یا مصداق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

پھر ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک جدیدیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اس میں یونیورسلز کا انکار ہے تو سرکار کھل کر کہیے کہ جدیدیت یونیورسل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ مسلمانوں کے لیے ناقابل ہے کیونکہ ان کا دین اسلام تو آفاقی ہے۔ پھر روایت کو دین کہنا بھی اس کی صحیح اور جامع تعریف نہیں ہے اور خود ڈاکٹر صاحب نے اسے علوم نبوت تک محدود رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جمہور مسلم علماء وفقہاء کی چودہ سو علمی میراث 'روایت' میں شامل نہیں؟ ہمارے اور جمہور اہل سنت کے نزدیک تو یہ روایت ہے لیکن متجددین اس کا انکار کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب بھی اسے علوم نبوت تک محدود رکھ رہے ہیں۔

۴۔ چوتھے پیراگراف میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر جدیدیت کے افکار کو

Unveil کیا جائے تو کفر نظر آتا ہے لیکن ہم مسلمانوں نے ان کی اقدار کو قبول کر لیا ہوا ہے اور وہ ہماری ادارتی صف بندی میں گویا Internalize ہو گئی ہیں۔ یہ بلاشبہ زمینی حقیقت ہے لیکن سوال درحقیقت یہ نہیں تھا اور نہ ہے کہ جدیدیت کو سمجھا کیسے جائے؟ سوال درحقیقت یہ تھا اور ہے کہ جب یہ کفر ہے تو اسلامی تناظر میں اس پر ہمارا ردّعمل کیا ہونا چاہیے؟ اس کے مقابلے میں ہمارا رسپانس کیا ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے جب یہ کفر ہے تو ہمارا ردّعمل یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اسے ردّ کریں لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہاں یہ نہیں کہا۔

۵۔ اپنی تحریر کے پیراگراف ۵ میں ڈاکٹر صاحب کھل کر کہتے ہیں کہ جدیدیت میں کوئی خیر نہیں ہے اور یہ اپنی اصل میں بھی باطل ہے اور مظاہر میں بھی۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب کا یہ مؤقف بہت صحیح اور قابل تعریف ہے۔ لیکن اسی پیراگراف میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ہیومنزم کا ایک ہی مطلب تھا، ایک ہی اس کا سبب تھا۔ وہ بائبل کا یہ جملہ تھا کہ ''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا''۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ ہیومنزم کے وجود میں آنے کا سبب یہ جملہ نہیں تھا۔ قرونِ مظلمہ کے بعد نشأۃ ثانیہ کے ظہور کے متعدد عوامل تھے ان میں سے ایک اس معاشرے کا پوپ اور مذہب کو ردّ کرنا تھا جو بادشاہت اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر عوام پر مظالم ڈھانے کے ذمہ دار تھے۔ ظاہر ہے خدا کے مقابلے میں انسان کو خودمختار اور مختارِ مطلق قرار دینے والا اور مذہب کو ردّ کرنے والا ہیومنزم بائبل کے اس جملے کی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس نے تو بائبل اور مذہب کو کونے میں دھکیل دیا اور پورے گھر پر قبضہ کر لیا۔

۶۔ چھٹے پیراگراف میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ جدیدیت سے ہمارے تعلق کی صورت کیا ہونی چاہیے؟ ڈاکٹر صاحب نے دو بہت خوبصورت باتیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں اس کے شر سے بچنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ ڈائیلاگ ممکن نہیں۔

۷۔ ساتویں اور آخری پیراگراف میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اچھی کہی ہوئی باتوں کی ایک دفعہ پھر تردید کر دی اور فرمایا کہ جدیدیت کے مختلف مظاہر (لبرل ازم، ہیومنزم، مارکسزم وغیرہ) کی نوعیت ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں دین میں حنفی، شافعی، مالکی مسالک کی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ دین اسلام حتمی طور پر حق ہے جبکہ یہ مسالک اجتہادی ہیں، ان میں غلطی کا

امکان ہوسکتا ہے اوران پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ تاہم یہ مسالک مذہب بیزاری کی راہ ہموار نہیں کرتے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ جدیدیت (؟) تو غلط ہے لیکن لبرل ازم، ہیومنزم، مارکسزم وغیرہ اس کی طرح قابل رد نہیں ہیں بلکہ ان میں صحت کا امکان بھی ہے؟ پھر وہ کہتے ہیں کہ ہم جس جدیدیت کو برا سمجھتے ہیں وہ استعماری جدیدیت ہے جس میں وہ خوبیاں موجود نہیں جو اہل مغرب کے ہاں جدیدیت میں ہیں۔ گویا ڈاکٹر صاحب یہ تاثر دے رہے ہیں کہ جو جدیدیت اہل مغرب کے پاس ہے (اور جو استعماری جدیدیت نہیں ہے) وہ زیادہ بری نہیں۔

قارئین کرام! ڈاکٹر صاحب کا مضمون پڑھنے اور اس پر ہمارا یہ تجزیہ دیکھنے کے بعد آپ خود فیصلہ فرمالیجیے کہ ڈاکٹر صاحب کی جدیدیت/ مغربی فکر وتہذیب پر تنقید کتنی سخت ہے یا کتنی نرم ہے؟ کیا وہ جدیدیت کو کلیتاً ردّ کر رہے ہیں یا اس میں بہت سے ifs and buts لگا رہے ہیں؟ میرا تاثر یہ تھا کہ ان کا مؤقف بَین بَین ہے یعنی نہ وہ جدیدیت کی کھل کر مذمت کرتے ہیں، نہ اسے کلیتاً ردّ کرتے ہیں بلکہ حیلے بہانے اس کے لیے نرم گوشہ ہی رکھتے ہیں۔ جبکہ البرہان کا مؤقف یہ ہے کہ جدیدیت/ مغربی فکر وتہذیب کا کلیتاً ردّ ضروری ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے اسلام کے مقابلے میں متوازی دین بن چکی ہے اور دو صدیوں کی غلامی کی وجہ سے معاشرے کے بہت سے عناصر اسے اپنائے ہوئے ہیں۔ اس تہذیب کے علمبردار ممالک اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ یہ نہ صرف قرآن کہتا ہے بلکہ ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے زوال سے نکلنے میں رکاوٹ ہیں، انہیں دین سے دور کر رہے ہیں اور انہیں فکری وعملی غلام رکھنے کے لیے پر امن کوششیں اور سازشیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں کسی مسلمان ملک کو اپنی غیر معمولی حربی قوت سے تباہ وبرباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ جدیدیت کو ردّ کر دیں اور اسلام کی طرف لوٹ جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں جدیدیت/ مغربی فکر وتہذیب کے خلاف بھرپور مہم چلائی جائے اور عوام الناس کو آگاہ کیا جائے کہ وہ اس اسلام دشمن تہذیب کے جال میں نہ پھنسیں لیکن ڈاکٹر رشید ارشد صاحب کا رویہ جدیدیت/ مغربی فکر وتہذیب کے خلاف واضح نہیں ہے بلکہ نیمے دروں نیمے بروں والا ہے۔

تزکیۂ نفس

پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی

نفسِ لوّامہ کی تلاش

نفس انسانی کی تین کیفیتوں کے لیے تین اصطلاحیں قرآن مجید سے اخذ کی گئی ہیں۔ ایک نفس امّارہ جو بُرائی کی ترغیب دلاتا ہے۔ استاد ذوق کہہ گئے ہیں:

بڑے مُوذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا

ایک نفس مطمئنہ ہے جو نیکی اور حق پر مطمئن ہو کر ربّ کی بندگی کا حق ادا کرتا ہے اور جنت کا مستحق ہوتا ہے اور ان دونوں کے بیچ میں نفس لوّامہ آتا ہے جو برائی اور غلطی پر ملامت کرتا ہے اور یوں انسان کو اپنی لغزشوں پر نادم ہو کر ان کی اصلاح پر آمادہ کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو انسان کو روحانی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والا یہی نفس لوّامہ ہے اور اسی سے شرافت کا چلن قائم ہے۔ کیونکہ اپنی غلطی پر نادم ہونا شرافت کی علامت ہے۔

اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ابلیس نے بھی کی اور آدم نے بھی۔ ابلیس کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کرے مگر اس نے کہا کہ مَیں اسے سجدہ نہیں کروں گا مَیں اس سے افضل ہوں، تُو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے خاک سے پیدا کیا۔ آدم سے کہا گیا کہ تُو اور تیری بیوی جنت میں ہنسی خوشی رہو سہو، کھاؤ پیو مگر اس ایک درخت کے پاس نہ جانا۔ آدم نے اس درخت کا پھل کھا لیا تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابلیس کی نافرمانی تکبر کی بنیاد پر تھی کہ اس نے خود کو بڑا سمجھا۔ آدم کی غلطی خواہش نفس کے باعث تھی کہ جس چیز سے روکا گیا تھا اس کی انجانی کشش میں گرفتار ہوا۔ اس سے بھی اہم فرق دونوں کے ردّعمل کا ہے۔ آدم سے غلطی تو سرزد ہو گئی مگر فوراً ہی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم سراسر خسارے میں رہیں گے۔ اس کے مقابلے میں ابلیس نے اپنی برتری کی دلیل دی اور کسی بھی مرحلے پر ندامت اور اعتراف کی کیفیت اس کے ہاں پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے معافی مانگنے کے بجائے قیامت تک کی مہلت مانگی تاکہ ہمیشہ بندوں کو خدا کی راہ سے بھٹکاتا رہے اور یہ معلوم کر لینے کے بعد بھی کہ اس طرزِ عمل کا انجام جہنم کی آگ ہے، وہ اس پر ڈٹا رہا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۶۵)

and halal business through a fully articulated tamveeli system should be a central concern of the Islamic revolutionary agenda so that non-capitalist property forms emerge and flourish in the national economy the encroachment of capitalist property on mass level is restricted and the ground is prepared for delinking the national economy from global value chain networks – the global *dar-al-harb.*

Politically the human rights challenge is expressed in the legitimation of human rights discourses by Islamic groups – especially Islamic political parties. Revolutionary ulema must urgently address the task of demonstrating that human rights are the anti-thesis of *huqu-al-ibad* and that the social practice of human rights ideology necessarily secularises the lifeworld.

Today all Islamic political parties in Pakistan (and in Turkey, Tunisia, Egypt) present themselves as instruments for the promotion of capitalist justice. Their political agenda are loaded with liberal, social democratic and national promises and themes. It should be the prime concern of revolutionary ulema to demonstrate that capitalist justice is *zulm-e-azeem* for it entails submission to the commands of the *nafs-e-ammara.* Championing capitalist justice and its human rights is a sure route to the secularization of Islamic political parties.

At the social level human rights ideology is being propagated by imperialist camp followers, quislings and fellow travelers. In Pakistan they are entrenched in the English print and electronic media and the imperialist funded NGOs led by the Human Rights Commission of Pakistan. it is obligatory for Islamic revolutionaries to uncover the face of these imperialist stooges and to oppose their moves to secularization of Pakistani society.

The global *dar-al-harb* is using the human rights weapon to subvert Islamic rule in Afghanistan and Iran. Human rights propaganda is being intensified to dilute the support of the Muslim masses for their Islamic governments. We must counter the propaganda by uncovering the true face of human rights ideology and praxis. We must support the Islamic regimes to stand firm in the face of the imperialist onslaught.

The imperialist human rights attack on both Iran and Afghanistan focuses on formenting rebellion against Islam among Muslim women. Those who were resoening the mother of all bombs on their heads are now championing the cause of women's human rights, as substitutes for the bombs. Immense pressure is being exerted through UN sponsored "humanitarian aid" to force the Islamic governments to bring women into the public sphere. Iran has partially succumbed to this pressure with disastrous social and political consequences. Afghanistan is standing firm and it is the duty of Islamic revolutionaries throughout the world to expose imperialist designs and vindicate the Islamic Emirate's policies for safeguarding the chastity of Muslim women in that country.

In secular Muslim countries – Pakistan, Turkey, Malaysia, Indonesia, Saudi Arabia, Nigeria etc. – the human rights challenge has to be met at the economic, political and social levels.

At the economic level, Islamic revolutionaries should seek to strengthen the traditional *bazar* and non-capitalist (i.e. *halal*) business. In Pakistan, for example, over 40 percent of gross value added is generated by the informal sector – a sector with no direct dependence on the money and capital markets, national or international. Promoting self employment

dedicated to capital accumulation is financialization and securitization – the expression of physical assets in the form of fictitious financial values – has established the dominance of the financial transactional structures over all wealth creation and distribution activities. Moreover the comodification of money – through the banking system – ensure that all wealth is entrapped in the circuit of capital. *Haramkhori* becomes the dominant norm. as the reach of the financial markets grows (through securitization) to encircle wealth creation the scope for earning a *halal* livelihood shrinks and is further constrained through state regulation, documentation and taxation and through unavoidable absorbtion within global financial value chains. Men and women are forced to become human for their survival. This is the meaning of the rule of law of capital.

Our Response

The key instrumentality for the systemic dominance of human rights imperialism is the capitalist state. It is the capitalist state which enforces human rights and enacts the project of transforming men and women into human beings. Thus the essential Islamic revolutionary response to human rights imperialism is the struggle to establish non-capitalist Islamic revolutionary states.

By the grace and mercy of Allah two such states have been established – Iran and Afghanistan and one of them has endured for almost half a century. These are exceptional Islamic states – exceptional in that such Islamic states have not typically existed in our history at least until the 19th century. They are exceptional precisely in the sense that they exist in a global *dar-al-harb*.

century. It is now called the "war of terror" and under its banner America continues to slaughter non-humans in Iraq, Syria, Afghanistan and Somalia, Russia in Chechnya, China in Eastern Turkestan, Israel in occupied Palestine, Bharat in occupied Kashmir, France in Mali and Burkina Faso. The *mujahideen* are of course all non-human and imperialist human rights flag bearers have the duty to slaughter them mercilessly while preaching peace.

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

The Right to Freedom of Expression

Freedom of speech entitles Facebook, Google, TikTok, Amazon etc. to colonize the world of information processing and to commercialise knowledge. It celebrates the burning of the Quran by Danish politicians and ridiculing and cursing the Prophet (saw) by the French and Dutch. On the other "extremist" (i.e. Islamic revolutionary) values are banned from the mainstream media. This is strictly in accordance with humans rights ideology for the freedom of speech is nothing but an instrument for capital accumulation. The first manifestation of the freedom of speech occurred during the French Revolution (1789-93) when thousands of Christian priests and nuns were slaughtered for worshipping God. The commodification of information and the monopolization of the media industry is crucially important for enforcement of the right to freedom of speech as it is the principle means for denying voice to the non-human men and women.

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

The Right to Possession

Today the principle means for ensuring that all wealth is

justification for them in the holy Bible and a few years later (1713) a Lutherean priest – Wilhelm Forstner – said human rights were awarded to man by the Devil. This of course is true but the Devil did not bestow human rights to man directly. He bestowed them on man through the agency of the constitutional capitalist state. That is why every capitalist state – liberal, socialist, fascist – enshrines human rights in the preamble of its constitution as inviolable holy writ.

Major capitalist states – America, Britain, France, USSR, China, Israel, Bharat – have been (or aspire to be) imperialist states. They have always used human rights doctrines to institute their imperialist order. Today the UN system, international financial regulatory bodies, rating and standardization agencies and globally funded NGOs are being used for the same purpose by their imperialist masters.

Let us see how the three fundamental human rights – the right to life, expression and ownership – are used as tools for imperialist governance.

The Right to Life

Man has a right to live provided he is human – i.e. he is committed to autonomy and this commitment is expressed in an obsessive compulsion to accumulate capital. Thus Locke justified the slaughter of 80 million Red Indians in America on the grounds that they are not creating value – they were not accumulating. Hence they were not human. They were just like the animals that roamed the prairies – George Washington called them “wolves”. The human rights granted to the settlers by the constitutional republic entitled the settlers to slaughter the Red Indians, dispossess them, loot their belongings, rape their women, burn their villages, decapitate their children.

Human rights imperialism is thriving in the twenty first

Dr. Javead Akbar Ansari

Human Rights: An Imperialist Weapon

Today Islam is surrounded by a global *dar-al-harb* – a *dar* (world order) irrevocably committed to waging a never ending war (*harb*) against Islam. The justification of this ceaseless attack is provided by the theory and practice of human rights imperialism. It is thus necessary for Islamic revolutionaries to understand this theory and practice so as to counter attack the enemy.

The Human Rights Doctrine

Human rights ideology and imperialist world domination were twin births – both originate in the seventeenth century. The founding father of human rights ideology is John Locke. Locke provided the Lobour Theory of Value which doctrinally grounds human rights ideology.

According to the Labor Theory of Value man's being is manifested in possession in the form of property. Property according to Locke consists of (a) man's body (b) man's volition/thought (c) man's estate – his material possessions. Man creates "value" by mixing the labor of his body and thought with nature – which takes the form of his national possessions (capital).

Human rights are the rights which entitle a man to participate in value creation – to dedicate his body, thought and wealth for the sole purpose of "value" – i.e. capital – creation and accumulation. Men and women who do not dedicate their bodies, thoughts and wealth to the sole purpose of value/capital creation and accumulation are not "human" and of course not entitled to any human rights.

Human Rights Imperialism

Who gave man these human rights? Locke could find no